جلد ۸۸ — دسمبر ۱۹۷۷ء — عدد ۴

۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے اجزاء

تفسیر پارۂ اوّل	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- "
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ "
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- "
تفسیر سورہ لقمان	۲/- "
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ "
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ "

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۸ | دسمبر ۱۹۷۷ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۹۷ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا -

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف شدہ ایک ایسی عالی شان مسجد جو مسلمانوں کی گنجان آبادی میں گھری ہوئی اُس کے برسوں مقفل رہنے کے بعد اگر اللہ کا کوئی بندہ اس کے منارے سے اذان کہے، لیکن پھر بھی اقامتِ صلوٰۃ نہ ہو سکے، امام غائب ہو اور نمازی عنقا، تو گویا طاغوتی قوتیں مؤذن کو ماحول کی زبان سے اذان کا یہ جواب دیتی ہیں کہ اس آبادی کو ہم مکمل طور پر تسخیر کر چکی ہیں، اور یہ تمہاری پکار کے حق میں ایک قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندوں کے اس قبرستان میں روحوں پر جذام اور قلوب پر فالج وارد ہو چکا ہے۔

اس تمثیل کی قندیل اُٹھائیے دنیائے حقیقت میں آئیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ایوانِ قوت سے غلبۂ اسلام کی صدا بلند ہوئی، مگر جواب اس کا بہ حیثیت مجموعی یہ ہے کہ ؎

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ایک بار پہلے بھی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے ایسی ہی آواز اُٹھی تھی، مگر اس کا انداز دوسرا تھا۔ اس وقت کے قرار دادِ مقاصد پاس کرنے والے حضرات سیاست کی جس بازی شطرنج کو کھیلتے کھیلتے یکایک خدا کی حاکمیت اور قانونِ شریعت کا نعرہ لگا گئے تھے، پلٹ کر پھر اُسی مہرہ بازی میں محو ہو گئے۔ اس وقت روحِ پاکستان یوں نالہ کش ہوئی کہ ؎

قرار دادِ مقاصد کے تم مصنف تھے
یہ صور پھونک کے اب کھو گئے کہاں آخر

صفِ نماز کھڑی ہے بہ انتظارِ امام
اذان پکار کے خود سو گئے کہاں آخر

مگر اب معاملہ دوسرا ہے۔ اب جوابدہی کا بار بہ حیثیت قوم ہم پر آپڑا ہے!

صورتِ حال بڑی پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔

آج واقعہ یہ بھی نہیں کہ قوم بے حس اور جمود زدہ ہو۔ جنوری ۱۹۷۷ء سے نظامِ مصطفٰے کے سرمستانِ جنون جب ایک بار اُٹھ کھڑے ہوئے تو در و دیوار اور دشت و بن ان کے والہانہ جذبات کی لمعانی سے جگمگا اُٹھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ سڑک سڑک لہو، اور چوک چوک میں لاشیں۔ ہسپتالوں میں زخم خوردہ فسطائیت کے ہجوم، اور جیلوں، حوالاتوں، تھانوں اور سی آئی اے کے اڈوں میں سرگشتگانِ عشقِ محمدؐ کے انبوہ!

قائدینِ اتحاد کا اشارہ رات کو ہوتا ہے کہ کل ہڑتال ہو گی۔ مختصر نوٹس اور کم ذرائعِ اشاعت و ترسیل کے باوجود اگلی صبح کو پورے پاکستان میں مکمل ہڑتال ہو جاتی ہے۔ لیڈر کہتے ہیں کہ چھ چھ افراد ہر روز گرفتاری دیں۔ شہروں، قصبوں اور بڑی دیہاتی آبادیوں میں چھ چھ افراد روزانہ نکلتے ہیں اور کسی مسجد میں تقریر کے بعد گرفتاری پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ گرفتاری بھی معمولی قسم کا سیاسی کھیل نہیں۔ زہریلی گیس کے بگولے اُٹھتے ہیں اور لاٹھیوں گولیوں کی بارش ہوتی ہے۔ مگر کیا مجال کہ "سجاکِ و خون غلطیدن" کا یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ گیا ہو۔ پھر شہر بہ شہر اور قصبہ بہ قصبہ علماء میدان میں نکلتے ہیں، وکلا کی صفیں آگے بڑھتی ہیں، نوجوان طلباء کا سیل اُمڈتا ہے، اور درندگی اُن کا استقبال کرتی ہے۔ حالات کا شدید بگاڑ دیکھ کر پردہ دار خواتین، چھوٹی چھوٹی بچیاں اور ضعیف و مریض مائیں تک برقعے اور آنچل اوڑھے اپنے آپ کو ظلم و قساوت کی قوت کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں —— اور اقتدار کی پستیٔ فطرت کی حد یہ ہے کہ وہ پوری قوم کے اس مقدس سرمایۂ حیا و عفت کے سامنے زنانِ بازاری کو پولیس کی وردی پہنا کر شریف عورتوں کو ان سے فحش گالیاں دلواتا اور پٹواتا ہے۔

مگر مظلومیت کا یہ کاروانِ بلاکش و بلاخیز نہ کہیں پیچھے ہٹتا ہے، نہ رُکتا ہے۔

تاریخ سیاسیات میں مشکل ہی سے کوئی نظیر ایسی ملے گی کہ دو ڈھائی ماہ تک اتنی پُر زور اور وسیع اجتماعی تحریک چار چھ دن سے زیادہ چلی ہو، اور ایسی نظیر بھی کہیں نہ ملے گی کہ ہر روز بے حساب قربانیاں دیتی ہوئی ایسی تحریک کے باوجود صنم خانۂ اقتدار کا صنمی چیف پروہت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو۔ سیاسی ڈھٹائی کی ایسی ردّی مثال دُنیا کی کسی گھٹیا جمہوریت میں بھی نہ ملے گی ۔ پاکستان کی سرزمین عجائبات میں جہاں اور کتنی بے مثل حوادث دیکھنے میں آتے ہیں وہاں اس آخری کرشمۂ فسطائیت کا ظہور بہت زیادہ غیر معمولی نہیں ؛ غلام محمد اور سکندر مرزا سے لے کر یحییٰ خاں اور اس کے بعد بھٹو تک قاہری و ساحری کے ادوار میں ہم نے کٹھ پتلیوں اور بازی گروں کے وہ وہ کرتب دیکھے ہیں کہ بار بار خدا یاد آیا۔

خیر، اب قوم پوچھتی ہے کہ ہمارا کیا قصور ؟ ہم نے سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملاً نافذ کردہ نظام اسلامی کے لیے تگ و تاز میں کیا کسر چھوڑی، ہمارے جوانوں نے سینوں پہ گولیاں کھائیں، ہمارے بوڑھوں نے لاٹھیوں سے سر و سینہ پہ زخم لیے، ہماری مستورات کے گلے زہریلی گیس کے مرغولوں نے گھونٹے، ہمارے کاروبار تباہ ہو گئے، قید اور مقدمے اور سزائیں اور قلعے کی ماریں ہم نے خندہ پیشانی سے قبول کیں۔

پھر اسلام کے نظامِ عدل و رحمت کی منزل کیوں دُور ہے ؟ کیوں دُور تر ہوتی جا رہی ہے ؟

یہ درد بھرا سوال آج پاکستان کی فضاؤں سے تاریخ میں چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اور مجھے بارہا محسوس ہوا کہ جیسے یہ سوال کبھی ایک نیزہ بن کر سینے میں اُتر جاتا ہے، کبھی نشتر بن کر کلیجے میں چھید کرتا ہے، کبھی برقی رو بن کر دماغ کے ذرات میں جھنجھناہٹ پیدا کرتا ہے ، یہ سوال ہر سوچنے والے صاحبِ دل سے اپنا جواب مانگتا ہے ۔

زخم رسیدگانِ ملت اور سرگشتگانِ حق سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کا جواب بالکل سامنے ہے۔

دَورِ غلامی میں غیر ملکی اور مخالفِ اسلام اقتدار نے یہاں اپنے مشن کے تحت سب سے اہم کام یہ انجام دیا کہ سیکولرازم کی زہریلی فصل دلوں اور دماغوں کی کھیتیوں میں بوئی ۔ اس نے ایک دنیا پرست، قوت پرست، دولت پرست اور خواہش پرست طبقے کو پروان چڑھانے میں بہترین قابلیتیں اور کاوشیں صرف کیں ۔ تعلیم کے ذریعے، لٹریچر کے ذریعے، مغربی فلسفے پر مبنی علوم کے ذریعے، مستشرقین کی تحقیقاتوں کے ذریعے، اسلام کے متعلق پادریوں کی یاوہ گوئی کے ذریعے، مغالطہ انگیز مناظروں کے ذریعے،

اخباری پروپیگنڈے کے ذریعے، ثقافتی اشغلوں کے ذریعے، عہدوں اور نوکریوں کے لالچ کے ذریعے خطابات اور درباری اعزازات کے ذریعے، کونسلوں کی ممبریوں کے ذریعے، ترقی کے مخصوص نصور کو عام کرنے کے ذریعے اور قوانین اور پالیسیوں کے ذریعے ایک مہم اس غرض سے چلائی گئی کہ اول تو اعلیٰ ذہانت کے نوخیز افراد کے دلوں میں الحاد اتنا کارفرما ہو جائے کہ اسلام کی دبی دبائی کوئی جڑ باقی نہ رہے، یہ نہیں تو پھر اتنا ضرور ہو کہ اسلام کا نام تو باقی رہے مگر زندگیوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اور یہ بھی نہ ہو تو بدرجہ آخر لیڈری، ملازمت، تجارت و معیشت اور فنون و ثقافت اور تمام اجتماعی معاملات کا دائرہ اسلام کے لیے ممنوع الدخول ہو جائے اور کوئی محدود و بے ضرر قسم کی ذاتی اسلامیت کو جاری رکھنا چاہے تو کرتا رہے۔ سیکولرازم کا سیلاب ایسی مذہبیت کو اپنے ساتھ لڑھکاتا جائے گا تاآنکہ اس کے ٹکڑے اور ذرات آہستہ آہستہ بکھر جائیں گے۔

یہ اسکیم مطلوبہ معیاری حد تک نہ سہی، مگر بے حد مؤثر ثابت ہوئی۔ خاص طور پر بیرونی مسلم دشمن طاقت نے اس پہلو سے اپنا اصل زور سیاسی قیادت اور سول سروس پر صرف کیا۔ یہاں تک کہ جب وہ آزادی دے کر رخصت ہو گئی تو ہمارے ہی اندر کا سیاست کار طبقہ اور ہماری ہی اپنی سول سروس کی مشینری کے پرزے سیکولرازم کے قلعے کے محافظ بن کر جان چھڑ بند ہو گئے۔ سیاست کاروں کو تو کچھ نہ کچھ عوامی رجحانات کا خیال کرنا پڑتا تھا لہٰذا انھوں نے بحیثیت مجموعی منافقت کو بہترین حربہ پا کر اسے خوب خوب استعمال کیا۔ پُرزور قصیدہ خوانی اسلام کی، اور معاملات کا نہج لادینی۔ بلکہ ایسے ایسے شہسوار اس میدان میں نمودار ہوئے کہ اسٹیج پر اسلام کے شیدائی و فدائی، اور ایوانِ حکومت میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے اور اسلام کو بےبست و پا کرنے کے لیے کچھ ویسا ہی کردار، جیسا شاہی قلعۂ لاہور کے محافظانِ امن و نظم کا اپنے کسی شکار کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کو پشت پناہی سول سروس کے خاصانِ خاص سے ملتی رہی۔ دنیا کی ہر سول سروس میں بڑی تعداد تو کولھو کے بیلوں کی ہوتی ہے، پھر ہمارے یہاں کچھ سادہ دل اور شرفا بھی خدمتِ قوم کا درد لیے اس کوچۂ ملامت میں جا نکلتے ہیں۔ وہ بیچارے یا تو ساری عمر گرامر کے فعل کی ایک ہی قسم یعنی سہنے (اور بھگتنے) سے دوچار رہتے ہیں، یا اگر سول سروس کی لکیر کی فقیری کرنے میں ہیر پھیر کریں تو کسی الزام کا نشانہ بن کر یا بلاکسی تہمت کے، ایسے سے باہر کر دیے جاتے ہیں۔ سول سروس کی اصل قوت وہ چند بااختیار اور ذہین و فطین لوگ

ہیں جو ایوانِ اقتدار میں آنے والی مختلف شخصیتوں اور متضاد قوتوں کے ساتھ ایسا تال میل پیدا کر لیتے ہیں کہ ہر نوگرفتارِ اقتدار ان میں سے کسی بھی شخص کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ کھرا سونا اور سچا ہیرا تو اب ہاتھ آیا۔ آنے والا اوّل تو اپنے نظریات و مقاصد کو غیر شعوری طور پہ ان سے ہم آہنگ کر لیتا ہے، لیکن اگر سول سروس کے خاص اساطین یہ محسوس کریں کہ اس شخص کے زہریلے دانت توڑ کے بانکالے نہیں جا سکتے تو وہ ایسا چکر چلاتے ہیں کہ خود اس شخص کو توڑ کے رکھ دیتے ہیں یا نسکال کے باہر پھینکوا دیتے ہیں۔ سیاست کاروں کے بخلاف، سول سروس کے جغادری کار پردازِ سیکولرازم کے قلعے کی برجیوں میں بیٹھتے ہیں اور ہر حملہ آور سے — خواہ وہ جنابِ اسلام ہی کیوں نہ ہوں — بڑی خوبصورتی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اہم اور مؤثر محکموں اور اداروں کے اندر رکمین گاہوں اور تہ خانوں میں جگہ بناتے ہیں۔ سیکولرازم کے ان محافظوں کا آپس میں خصوصی رابطہ رہتا ہے۔ سیاسی قوت کے لیے ان کا اوّلین حربہ خوشامد ہے — خوشامد عام قسم کی نہیں، بلکہ نہایت نستعلیق قسم کی، پُرخلوص دکھائی دینے والی، محتاط خوشامد۔[۱] خوشامد کے ساتھ دوسرا ہتھیار خوف دلانے کا ہے۔

ان دو قوتوں کے درمیان ایک تیسری قوت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ ہے خیانت! اس طرح تثلیث مکمل ہو گئی — خوشامد، خوف، خیانت!

سول سروس کے چند خاص شاطرانِ پس پردہ کے علاوہ تعلیم، صحافت، ذرائعِ ابلاغ، نشریاتی اور ثقافتی اداروں اور ادب و فنون کے مختلف دائروں[۲] میں سیکولرازم کے محافظ اور سنتری ایسی جگہوں پہ قابض ہوتے ہیں جہاں سے وہ کچھ برقی بٹنوں پہ انگلیاں رکھتے ہیں اور دُور کہیں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ملک بھر میں ایک جالا سا تنا ہوا ہے اور خاموشی سے بہت سے مکڑے مکڑیاں تاریک گوشوں میں دبک کر

---

[۱] دنیا بھر کے اہم ممالک کی سول سروس کا فارمولا یہ ہے "YES SIR ..... BUT SIR ...." - "یس بٹ" کے بعد یہ لوگ ایسا منتر پڑھتے ہیں کہ بڑے بڑے اہل خودی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

[۲] فوج کے متعلق اس معاملے میں میری معلومات صفر ہیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ آیا وہاں بھی سیکولرازم کے محافظین اسی طرح نفوذ یافتہ ہوتے ہیں یا نہیں۔

اس جال کے نئے نئے تار بنا کر پھیلا رہے ہیں۔

قوم کے نوجوان جب سینوں پر گولیاں کھا رہے تھے اور بوڑھوں کے سروں پر لاٹھیاں برس رہی تھیں اور خواتین گیس کے طوفان میں گھری ہوئی تھیں تو اس وقت بھی یہ مکڑے مکڑیاں اپنا کام کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب تخت سے اُتار دیے گئے، مگر ان مکڑوں اور مکڑیوں کی راجدھانی برقرار رہی۔

اسلام اُس وقت قوت پا سکے گا، جب سیکولرازم کے باڈی گارڈز میں سے ایک ایک کو کوئی بصیرت مند مردِ مجاہد اگر ختم نہیں، تو بے اثر اور بے وزن اور بے وقعت کر کے ایک طرف ڈال دے گا۔ یہاں تک کہ مادہ پرستانہ نظریات کی ایجنسیاں ختم ہو جائیں اور بیرونی تہذیب و ثقافت کی اسمگلنگ کرنے والوں کی چور بازاری کا سلسلہ ٹوٹ جائے۔

سول سروس اور ذرائع نشر و ابلاغ کے دائروں میں نفوذ یافتہ گرگانِ باراں دیدہ کے سامنے ایک اور قوت بڑا اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ یہ ہوتے ہیں ٹکنیکل ماہرین۔ ظاہر بات ہے کہ ٹکنیکل ماہرین کے تعاون کے بغیر کوئی بھی اسکیم نہیں چل سکتی۔ ٹکنیکل ماہرین — وہ اقتصادیات سے متعلق ہوں، بنکنگ اور انشورنس سے متعلق ہوں، یا تعلیم یا کسی اور شعبے سے متعلق — انہیں سیکولر نظامِ تعلیم نے جو مواد رٹایا ہوتا ہے، اور پھر سیکولر انتظامیہ میں پرزہ بن کر رہنے کی وجہ سے جو تجربات اُن کے دماغوں پر لد جاتے ہیں ان کی وجہ سے ان کی شخصیتیں ایک خاص سلانچے میں ڈھل کر منجمد ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے جن خوش نصیبوں کے دلوں میں ایمان کی کرنیں اُترتی بھی ہیں۔ وہ بھی اپنے مخصوص طور اور اصطلاحات (TERMS & TECHNIQUE) کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ ان میں نئے نہج سے نئے اصولوں پر کام کرنے کے لیے تخلیقی ذہن ہی موجود نہیں ہوتا۔ اور پھر ان میں ڈبنگ قسم کے کچھ لوگ دَورِ حاضر کے نظریات و تحریکات کے آلۂ کار ہوتے ہیں۔ آپ جب ان کے سامنے اسلامی مقاصد کے لیے ادارات اور عوامل میں کسی اہم تبدیلی کا کوئی آئیڈیا رکھتے ہیں تو وہ ٹکنیکل مہارت کے مقامِ بلند سے اس کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لینے اور بحث و تحقیق کرنے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ چیز تو ناقابلِ عمل ہے۔ فنی مہارت کے سامنے ہر کسی کو سرِ تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ٹکنیکل ماہرین جہاں خود بیشتر سیکولرازم کے اسیرِ قفس ہوتے ہیں، وہاں انہیں یہ ٹکنیکل مہارت بھی حاصل ہوتی ہے کہ نظامِ رائج کے سیکولر قفس سے بڑے سے بڑے اہلِ عزیمت کو بھی نہ نکلنے دیں وہ دلائلِ محکم کے سامنے یہ یقین دلاتے ہیں کہ جہاں یہ قفس ٹوٹا، اور ہم نے باہر کی فضا میں پرواز کی، سب کچھ

نہس نہس ہو جائے گا۔

مثلاً آپ ٹکنیکل ماہرین کو بٹھا کر پوچھیں کہ جامعۂ خواتین کا وجود ممکن ہے؟ اور ممکن ہے تو اس کے امتیازات کیا ہونے چاہئیں؟ یا پوچھیے کہ تعلیم میں اسلامی انقلاب کیسے واقع ہو سکتا ہے؟ یا دریافت کیجیے کہ بلا سود بنک کاری قابلِ عمل ہے یا نہیں؟ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان میں سے ہر سوال پر غور ہوگا، مطالعہ ہوگا، تحقیقی کام ہوگا، میٹنگز ہوں گی، ان میں بڑی دردمندی اور سنجیدگی سے بحثیں ہوں گی، لیکن آخری نتیجہ یہی ملے گا کہ یہ کچھ تو ممکن نہیں ہے۔

اور کوئی نان ٹکنیکل دماغ قابلِ عمل راستہ نکال بھی سکتا ہو تو یہ حضرات اُسے خاص ٹکنیکل اصطلاحات اور مروجہ فارمولوں کے پتھروں سے ایسا مضروب کریں گے کہ بات کرنا مشکل ہو جائے۔

ان سے کام لینے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ کوئی انقلابی ذہن کی قیادت ہو، وہ تخلیقی تفکر و تدبّر سے کام لینے والے قابلِ اعتماد دو چار افراد سے ذاتی سطح پر مشورہ لے، اور پھر ایک طے شدہ امر ٹکنیکل ماہرین کے سامنے رکھ دے کہ فلاں کام فلاں اصول و مقاصد کے ساتھ، فلاں نہج سے، اتنی مدت میں کرنا ہے۔ آپ اپنی ٹکنیکل مہارت استعمال کر کے ایک عملی بلیو پرنٹ بنا دیں۔ اگر اس کی صلاحیت نہ ہو تو مشورہ یہ ہے کہ آپ چھٹی کریں۔

خالص لادینیت اور کھلے کھلے سوشلسٹ الحاد کے سرپرستانِ خاص تو ذرا کم تعداد میں ہیں، ان کے ساتھ بہت سی تعداد مغرب پرستوں، اباحیت پسندوں اور بندگانِ مفاد کی شامل ہے۔ جب کبھی اسلام کی آمد کا خطرہ رونما ہو تو یہ سب مل کر ایک زیرِ زمین محاذ بنا لیتے ہیں۔ اُوپر سے دیکھیے تو سب اچھا نظر آتا ہے۔ کسی بِل کو کھود بیٹھے تو اندر ہی اندر دُور تک سرنگیں چلی جاتی ہیں اور ان میں جا بجا کیمپ لگے ہوئے ملتے ہیں۔ الحاد پسند معاندینِ اسلام کے پیچھے پیچھے جن اسلام گریز لوگوں کی صفیں دکھائی دیتی ہیں، وہ عوامی رجحانات کے زیرِ اثر اسلام کی بات پر آمین تو کہہ دیتے ہیں، مگر وہ اسلام کا ایسا ایڈیشن چاہتے ہیں کہ جو ان کی زندگیوں میں کوئی گڑبڑ نہ پیدا کرے۔ ان کا مطلوب "سیکولر اسلام" ہے۔ یعنی رشوت، ملاوٹ، اسمگلنگ، ناپ تول کی خرابی، قیمتوں کی زیادتی، قانون شکنی، سرکاری املاک میں تصرفِ ناروا، (باقی بر صفحہ ۴۴)

تجدیدِ عہد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عید الاضحیٰ کے موقع پر جامع منصورہ میں عید کی نماز اور خطبے کے بعد تجدید عہد کا میثاق پڑھا اور اس کے ہر فقرے کو حاضرین دہراتے رہے۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ عہد جو آپ نے کیا ہے، اس کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ایک عبارت ہی پڑھ دی گیا اور آپ اُسے دہراتے گئے، بلکہ آپ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی اور سے نہیں، مالکِ کائنات سے عہد ہے، اور آخرت میں اس کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ عہد جو کیا تھا اس کو کہاں تک پورا کیا۔ مالکِ کائنات ہر ایک شخص کے متعلق جانتا ہے کہ اُس نے بالارادہ عہد کیا ہے یا فقط ایک عبارت اپنی زبان سے دہرا دی ہے۔ مالکِ کائنات جانتا ہے کہ یہ عہد کرتے وقت آپ کی نیت اس کو پورا کرنے کی ہے یا نہیں۔ اور ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب اس کے متعلق آپ سے باز پُرس کی جائے گی۔ اللہ کے ساتھ عہد کا معاملہ ایسا زبردست اور اہم ہے کہ بنی اسرائیل کے سروں پر کوہِ طور اُٹھا کر اُن سے عہد لیا گیا تھا، تاکہ انہیں یہ احساس رہے کہ انہوں نے اس عظیم ہستی سے پیمان باندھا ہے جو پہاڑ کو اُٹھا کر اُن کے اوپر گرا سکتی ہے۔ اس لیے آپ اس کی اہمیت اور شدت کو اچھی طرح محسوس کیجیے اور یہ عزم کر لیجیے کہ جو عہد آپ نے اپنے رب سے کیا ہے وہ ٹوٹنے نہ پائے۔ خدا سے عہد کر کے اس کو توڑ دینے سے بہتر ہے کہ عہد کیا ہی نہ جائے۔

اس سلسلے میں اوّلین بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو عہد آپ نے کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہنے کی کوشش کریں، اس کے تقاضوں کو سمجھیں اور انہیں پورا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں۔

دوسری بات میں بطور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ جن جن لوگوں کو اس عہد نامے کی چھپی ہوئی

عبارت ملے وہ کم از کم دس نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے دوسروں تک پہنچائے۔ ظاہر بات ہے کہ چھ سات کروڑ کی تعداد میں چھاپنا اور ہر مسلمان تک اُسے پہنچانا کسی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ عہد نامہ ملے وہ اس کی دس دس نقلیں تیار کریں اور ایسے آدمیوں تک پہنچائیں جنہیں یہ مطبوعہ شکل میں نہیں پہنچا ہے۔ اس طرح یہ ان شاء اللہ پوری قوم میں پھیل جائے گا۔ پھر جس کو بھی آپ یہ دیں اُسے اس کی اہمیت کا احساس دلائیں اور اس سے کہیں کہ یہ عہد خود بھی کرو اور اپنے دوستوں، محلہ داروں، اور رشتہ داروں کو بھی خداوند تعالیٰ سے یہ عہد باندھنے پر آمادہ کرو۔ لیکن جو شخص بھی اس کے لیے تیار نہ ہو اُسے مجبور نہ کریں، کیونکہ عہد کر کے توڑنے والا دہرے گناہ کا مرتکب ہوگا۔

جو بندگانِ خدا اَن پڑھ ہیں ان کو آپ یہ عہد نامہ پڑھ کر سنائیں اور عہد لینے سے پہلے ان کو یہ بات سمجھائیں کہ اس میثاق کا مدعا کیا ہے؟ اس کا مدعا صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ہر شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور فرماں بردار بن کر رہے، بلکہ اس کا مدعا یہ بھی ہے کہ ساری قوم اللہ سے پیمان وفا باندھے اور یہ طے کرے کہ اب وہ اپنے معاملات کی باگ ڈور کبھی خدا کی نافرمانی کرنے والوں کے ہاتھ میں نہیں دے گی۔ خوب سمجھ لیجیے کہ کسی قوم پر ظالم و جابر، سنگ دل و بے رحم، خائن و بددیانت اور فاسق و فاجر لوگوں کا مسلط ہو جانا اللہ کا عذاب ہے جو اسی قوم پر نازل ہوتا ہے جو خود اللہ کے راستے سے بھٹک گئی ہو۔ اس عذاب سے آپ بچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ مسلمان فرداً فرداً، اور ساری قوم بحیثیت قوم اطاعت کی راہ پر پلٹ نہ آئے، اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ نہ کر لے کہ آئندہ وہ کسی ایسے شخص یا گروہ کو اپنا سربراہ کار نہ بنائے گی جو جھوٹا اور بے ایمان ہو، خائن اور بددیانت ہو، فاسق و فاجر ہو، شرابی اور زانی ہو، دین سے نابلد، یا دانستہ اس سے منحرف ہو۔ خدا سے کسی قوم کا پیمان وفا باندھنا لازمی طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک جمہوری نظام میں جب اپنے حاکموں کا انتخاب خود اس قوم کے اختیار میں ہو تو وہ بدکار و بدراہ لوگوں کو چھوڑ کر اقتدار کی باگیں اُن لوگوں کے ہاتھ میں دے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں، ایماندار ہوں، انصاف کرنے والے ہوں، دین کو سمجھتے بھی ہوں، اُس کو نافذ کرنے کے اہل بھی ہوں، اور خلوص دل کے ساتھ اسے نافذ کرنے کا عزم بھی رکھتے ہوں۔ ورنہ اب پھر انتخاب کا موقع آنے پر اگر فساق و فجار ہی کو اقتدار مل گیا تو خوب اچھی طرح یہ سمجھ لیجیے آپ کے اس عہد کے باوجود یہ عہد آپ

کے سامنے توڑا جائے گا اور آپ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے میں آپ سے آخری بات یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کا فرض صرف خود عہد کرنا نہیں ہے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ دوسرے بندگانِ خدا تک اس کو پہنچانا اور اس کے معنی و مفہوم اور اس کے تقاضوں کو سمجھانا بھی ہے اور صاف صاف یہ بتا دینا بھی ہے کہ قومی حیثیت سے اس پر عمل نہ کرنے کے بُرے نتائج کیا ہیں۔ تمام صاحبِ ایمان اور ذی شعور لوگوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے وقت اور محنتوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ ملک کے عوام میں یہ شعور پیدا کرنے پر صرف کر دیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے کہ اب جو ہم نے عہد کیا ہے اس کے ساتھ ہم وہ معاملہ نہ کریں جو تحریک پاکستان کے زمانے میں کیا تھا۔ اس بدعہدی کا بدترین خمیازہ ہم بھگت چکے ہیں۔ اللہ نے اس وقت ہماری آزمائش کے لیے ہمیں پاکستان دیا تھا۔ مگر جب ہم اپنے عہد سے پھر گئے تو اس نے ہم پر اُن جابروں کو مسلط کیا جو خلقِ خدا پر رحم کرنا نہیں جانتے تھے، ان لوگوں کو مسلط کیا جو ساری قوم کے اخلاق اور دین کا ستیاناس کرنے والے تھے، ان لوگوں کو مسلط کیا جنھوں نے قوم کو بُرائیوں کی طرف دھکیلا اور بھلائیوں کے راستے سے روکا۔

اب یہ دوسرا عہد سوچ سمجھ کر کیجیے۔ یہ اس طرح کا عہد نہ ہو جو تحریک پاکستان کے زمانے میں کیا گیا تھا۔ خداوندِ عالم ہمیں عہد شکنی سے اور اس کے بُرے نتائج سے بچائے۔

تعزیراتِ اسلام

حصہ اوّل ــــ باب اوّل

سرقہ کے بیان میں

از جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب

(۲)

لغت عرب میں سرقہ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی آدمی خفیہ طور سے دوسرے کی چیز کو محفوظ جگہ سے لے جائے۔[۱]

دفعہ ۱ - اقسام سرقہ | سرقہ کی دو اقسام ہیں - ۱ - سرقہ موجبِ تعزیر ۲ - سرقہ موجبِ حد

دفعہ ۲ - سرقہ موجب تعزیر کی تعریف | سرقہ موجب تعزیر سے مراد وہ سرقہ ہے جس کی سزا شریعت میں متعین نہ ہو بلکہ قاضی کی صوابدید پر منحصر ہو۔ اگر سرقہ موجبِ حد کو نہ پہنچے تو اس کا شمار موجبِ تعزیر میں ہوگا۔

دفعہ ۳ سرقہ موجب حد کی تعریف | کوئی مکلّف، ناطق، بصیر شخص، دوسرے کا مال، جو دس درہم یا اس کی قیمت کو پہنچتا ہو، قدرتی طور پر جلدی بگڑ جانے والا نہ ہو، ملک اور شبہ ملک سے خالی ہو، اس میں معقول تاویل کی گنجائش نہ ہو، خفیہ طور پر بنیتِ سرقہ لے جائے، تو کہا جائے گا کہ اس نے سرقہ موجبِ حد کا ارتکاب کیا ہے۔[۲]

تشریح ۱ | مکلّف، ناطق اور بصیر، ان تینوں صفات کا تعلق مجرم سے ہے۔ اور اگر مجرم کے اندر یہ سب یا ان میں سے کوئی ایک صفت معدوم ہو تو حدِ سرقہ عائد نہ ہوگی۔ سرقہ کی مذکورہ تعریف درحقیقت شرائطِ سرقہ کا مجموعہ ہے، جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

---

[۱] قاموس بحوالہ تفسیر مظہری ص ۹۷ جلد ۲ -

[۲] بحر الرائق و مرقات شرح مشکوٰۃ ۱۵۳ ج ۷، مطبوعہ ملتان -

۲ - امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد سرقہ اُس کافر پر بھی نافذ ہوگی جو ذمی ہو، اور اگر حربی مستامن ہو (یعنی ایسا کافر جو کچھ عرصہ کے لیے امان لے کر اسلامی حکومت میں رہتا ہو) تو اس پہ حد سرقہ نافذ نہ ہوگی ۔ مگر امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر بھی حد نافذ ہوگی ۔ علامہ ابن عابدین شامی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے[1]۔

۳ - اگر مجنون نے حالت جنون میں سرقہ کیا ہو، یا مجرم نابالغ ہو، تو اس پر حد جاری نہ ہوگی[2]۔ البتہ اگر مجنون نے افاقہ کی حالت میں سرقہ کیا ہو تو اس پہ حد نافذ ہوگی ۔ لیکن حد کے نفاذ کے لیے اس کے جنون سے تندرست ہونے کا انتظار کیا جائے گا[3]۔

۴ - بلوغ کی مدت : اِس کے بارے میں فقہا کا اس بات پر تو اتفاق ہے کہ جب بلوغ کی علامات ظاہر ہو جائیں تو اس وقت سے لڑکی، لڑکا بالغ شمار ہوں گے ۔ لیکن اگر بلوغ کی علامات ظاہر نہ ہوں تو اس میں اختلاف ہے ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لڑکا اٹھارہ سال کا بالغ ہوگا اور لڑکی پندرہ سال کی ۔ صاحبینؒ کے نزدیک لڑکا اور لڑکی پندرہ سال کے بالغ شمار ہوں گے ۔ امام ابوحنیفہ کا بھی ایک قول صاحبین کی تائید کرتا ہے ۔ اسی طرح امام شافعیؒ کا بھی ایک قول صاحبینؒ کی رائے کا موید ہے ۔ فقہ حنفی میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے[4] جس کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے ۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی پر بھیجنے کے لیے میرا معائنہ کیا تو مجھے چھوٹا قرار دے کر واپس کر دیا ۔ اس وقت میری عمر چودہ سال کی تھی ۔ پھر آپ نے جنگ خندق کے موقع پر میرا معائنہ کیا اُس وقت میری عمر پندرہ سال کی تھی تو مجھے لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی[5]۔ اس حدیث

---

[1] رد المحتار ص ۱۹۸ ج ۳ مطبوعہ بولاق مصر۔

[2] رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ و عن المبتلی حتی یبرا و عن الصبی حتی یکبر (بذل المجہود ص ۳۴۸ ج ۱۷)۔

[3] ایضاً

[4] ہدایہ ص ۳۵۸ ج ۳ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی۔

[5] مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۹۲ ج ۱ مطبوعہ نور محمد کراچی۔

سے واضح ہے کہ اگر بلوغ کی علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال کی عمر سے کم بالغ شمار نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت نافعؒ نے جب یہ حدیث حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو سنائی تو آپ نے فرمایا کہ بڑے اور چھوٹے کے درمیان فرق کرنے والی یہی عمر ہے۔ پھر آپ نے اپنے سارے عُمّال کو لکھ بھیجا کہ جس کی عمر پندرہ سال ہو جائے اس کے لیے وہ وظیفہ مقرر کرو جو جنگ کے قابل افراد کے لیے مقرر ہے اور جس کی عمر اس سے کم ہو اس کے لیے وہ وظیفہ جاری کرو جو بچوں کے لیے مقرر ہے۔[۱]

تشریح ۲: قبضے کی اقسام۔ تعریف میں جو ذکر ہے کہ مال دوسرے شخص کا ہو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا قبضہ مال پر قبضۂ امانت یا مِلک یا ضمان، اِن تینوں میں سے کوئی ایک صحیح ہو جس کی بنا پر وہ نالش کرنے کا حقدار ہو۔ مثلاً وہ ان لوگوں میں سے ہو جو مالک، اَمین، مُرتَہِن، ضامن، نابالغ کا والد، متولّی، وصی اور مَبیع پر خریداری کی نسبت سے قبضہ کرنے والا ہو۔[۲] اگر قبضہ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کوئی نہ ہو تو سارق پر حد جاری نہ ہوگی۔ مثلاً سارق سے اسی مال کو کوئی دوسرا آدمی سرقہ کر کے لے جائے تو اگر پہلے پر حدِ سرقہ ابھی جاری نہ ہوئی ہو تو پہلا قائم مقام غاصب کے ہوگا اور اس کا قبضہ مال پر قبضۂ ضمان ہوگا۔ اس کی نالش سے دوسرے پر حد جاری ہوگی۔ اور اگر پہلے پر حد نافذ ہو چکی تھی اور اس کے بعد دوسرا اس مال کو چوری کر کے لے گیا تو اس صورت میں پہلا نالش کرنے کا حقدار نہیں رہا، اس لیے کہ حد کے نفاذ کے بعد اس کا قبضہ اس مال پر تینوں قسموں میں سے کسی قسم کا بھی نہیں ہے۔ لہٰذا دوسرے پر حد نافذ نہ ہوگی۔[۳]

تشریح ۳: د۔ کن چیزوں کی چوری پر حد نہیں ہے۔ حدِ سرقہ کے لیے مال مسروقہ کا نصابِ سرقہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا" (چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو)، عام ہے۔ اس سے اتنی بات تو معلوم ہوتی ہے کہ سرقہ کی سزا قطع ید ہے، مگر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ کتنی مالیت کے سرقہ پر قطع کی سزا دی جائے گی۔ آیت کے عموم کا تقاضا تو یہ ہے کہ مال خواہ کم قیمت کا ہو یا زیادہ، اور

[۱] کتاب الخراج لابی یوسفؒ ص ۴۹۰ مترجم اُردو۔

[۲] درمختار ص ۲۱۴ ج ۳۔

[۳] المبسوط للسرخسی ص ۱۴۵ ج ۹ مطبوعہ مصر۔

خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو، اس کے سرقہ پہ قطع ید کی سزا دے دی جائے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سرقہ کا نصاب متعین ہے، لہذا آیت کے مفہوم کی وہی تشریح معتبر ہے جو حضور نے فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حقیر چیز پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا[1]۔ حضرت رافع بن خدیج کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " درخت پر لگے ہوئے پھلوں اور پودوں پر قطع ید نہیں ہے[2]۔ عمرو بن شعیب کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخت پر لگے ہوئے پھلوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر کسی حاجت مند نے صرف ان کو کھایا ہو اور اس سے دامن بھر کر نہ لے گیا ہو تو اس پہ کوئی سزا نہیں ہے اور اگر کچھ لے کر گیا ہو تو اس پہ تاوان ہے۔ اور اگر اس نے اتنا سرقہ کیا ہو جس کی قیمت ایک ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو اس پر قطع ید ہے[3]۔

مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوا کہ معمولی مقدار کے سرقہ پہ حد سرقہ نافذ نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے مقدار متعین ہے جس سے ثابت ہوا کہ آیت اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ اس کے اندر حدیث سے تخصیص پیدا ہو چکی ہے۔

ب۔ نصاب سرقہ: اب رہی یہ بات کہ نصاب سرقہ کیا ہے؟ تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک چوتھائی دینار نصاب سرقہ ہے۔ امام مالک کے نزدیک تین درہم نصاب ہے۔ اور احناف کے نزدیک کم از کم دس درہم یا ایک دینار[4] یا اتنی قیمت کی کوئی چیز[5] ہے۔

امام شافعیؒ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" ہاتھ   دینار کے چوتھے حصے یا اس سے زائد پہ ہی کاٹا جائے گا[6]۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سرقہ کے ایک واقعہ پہ اسی حدیث کے پیش نظر

---

۱ بحوالہ تفسیر مظہری ص ۱۰۵ ج ۳

۲ مشکوٰۃ باب قطع السرقہ

۳ مشکوٰۃ باب قطع السرقہ

۴ المبسوط للسرخسی ص ۱۲۷ ج ۹

۵ ہدایہ باب السرقہ۔

۶ متفق علیہ۔ مشکوٰۃ شریف ص ۳۱۳ باب قطع السرقہ۔

قطع ید کا فتویٰ بھی دیا تھا۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ:

عَمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ ان کے ساتھ دو آزاد کی ہوئی لونڈیاں تھیں اور عبداللہ بن ابی بکر کی اولاد کا ایک غلام بھی تھا۔ ان دونوں عورتوں کے ساتھ ایک چادر بھیجی جسے مراجل کہتے ہیں۔ اس کو ایک سبز کپڑے سے سی دیا گیا تھا۔ عمرہ کا بیان ہے کہ غلام نے سبز کپڑا پھاڑ کر چادر نکال لی اور اس کی جگہ نمدہ یا پوستین رکھ کر سی دیا۔ جب ہم لوگ مدینہ پہنچے تو یہ پلندہ اس کے مالک کو دے دیا۔ اُسے جب کھولا گیا تو چادر کے بجائے نمدہ نکلا۔ ان دونوں لونڈیوں سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مطلع کیا اور اس غلام پر شبہ ظاہر کیا۔ جب اس غلام سے دریافت کیا گیا تو اس نے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا "چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی چوری میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے"[۱]۔ یہ روایات امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ نصاب سرقہ موجب قطع چوتھائی دینار ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کا ہاتھ ایک ڈھال کی چوری کرنے پر قطع کیا تھا جس کی قیمت تین درہم تھی"[۲]۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں ایک چور نے "ترنجہ" چرایا تھا تو آپ نے اس کی قیمت لگانے کا حکم دیا۔ قیمت بارہ درہم فی دینار کے لحاظ سے تین درہم لگائی گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا[۳]۔ امام مالک رحمۃ اللہ انہی روایات کو اپنے مسلک کی بنیاد بناتے ہیں۔

نصاب سرقہ کے بارے میں امام شافعیؒ اور امام مالک کے درمیان حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ دینار کا چوتھائی حصہ اس وقت تین درہم کے مساوی تھا اور ایک دینار بارہ درہم کا تھا[۴]۔

---

[۱] مؤطا امام محمد ص ۳۱۱ باب ما یجب فیہ القطع۔ [۲] مشکوٰۃ باب قطع السرقہ ص ۳۱۳

[۳] مؤطا امام محمد ص ۳۱۲ باب ما یجب فیہ القطع

[۴] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۵۳ ج ۴ مطبوعہ ملتان۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ڈھال کی قیمت میں اختلاف ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے اگرچہ اس کی قیمت تین درہم معلوم ہوتی ہے، مگر عمرو بن شعیب کی روایت میں ڈھال کی قیمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دس درہم تھی۔[1] سعید بن المسیب کی روایت میں بھی یہی ہے کہ ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔[2] اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دس درہم کے سرقہ پر ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔[3]

ان تمام روایات کو دیکھنے سے نصاب سرقہ کے بارے میں تین درہم اور دس درہم دو مقداریں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر تین درہم سے کم نصابِ سرقہ ثابت نہیں ہوتا۔ ان میں سے امام ابو حنیفہؒ نے دس درہم کو نصاب سرقہ موجب قطع قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ دس درہم کے برابر سرقہ کرنے پر سب کا اتفاق ہے کہ مجرم پر حد سرقہ نافذ کی جائے گی۔ لہٰذا اس نصاب کے یقینی طور پر متعین ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہونا چاہیے اور وہ دس درہم ہی ہو سکتا ہے۔ خاص کر اس لیے بھی کہ دس درہم کے نصاب میں حد سے بچنے کا مسلمانوں کو راستہ مل جاتا ہے جو اس حدیث کا منشا بھی ہے:۔

"مسلمانوں سے حدود کو جہاں تک ممکن ہو سکے ٹالو۔ اگر ان کے لیے حد سے بچ جانے کا کوئی راستہ نکلتا ہو تو اُن کا راستہ خالی کر دو۔ اس لیے کہ حد کو معاف کرنے میں امام کا خطا کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں خطا کرے۔"[4]

دس درہم سے کم میں چونکہ اختلاف ہے جو شبہ کو پیدا کرتا ہے، اسی لیے دس درہم سے کم میں مسلمانوں کو حد سے بچ نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے دس درہم کو نصاب سرقہ قرار دے کر اسی احتیاط پر عمل کیا ہے۔

ج۔ شرائط نصاب۔ نصاب سرقہ میں وہ مال مسروقہ (موجبِ حد) شامل ہوگا جس میں مندرجہ ذیل شرائط موجود ہوں:۔

ا۔ اس مال کی اسلام کی نظر میں مالیت ہو:۔

مثلاً شراب اور خنزیر کی اسلام کی نظر میں مالیت نہیں ہے، خواہ اس کا سارق مسلمان ہو یا ذمی، اور

---

[1] مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۱۵۵ ج ۷ ، [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] مشکوٰۃ باب السرقہ۔

خواہ چرائے ہوئے مال کا مالک بھی مسلمان ہو یا ذمی [1] - اسی طرح آلاتِ لہو جیسے طبل، باجا، شطرنج اور بانسری وغیرہ - اس طرح کی چیزیں نصابِ سرقہ (موجبِ حد) میں شامل نہ ہوں گی [2]

اسلام کی نظر میں جو چیز مالیت رکھتی ہو، مگر اس کی قیمت متعین نہ ہو، اس کی قیمت دو عادل اور قیمت لگانے میں ماہر اشخاص متعین کریں گے [3]

۲ - مقصود بالذات ہو [4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ سارق نے جس مال کا سرقہ کیا ہے اس کا مقصود صرف یہی مال تھا - بعد میں اگر اس کو اس مال کے ضمن میں اور بھی کوئی مال مل گیا جس کا اس نے بوقت سرقہ قصد نہ کیا تھا تو یہ ضمنی مال نصابِ سرقہ میں شامل نہ ہوگا - مثلاً سارق نے ایک کوٹ چوری کیا اور بعد میں اسی کوٹ سے اس کو کچھ نقدی روپیہ یا کوئی چیز مل گئی تو یہ چیزیں نصابِ سرقہ میں شامل نہ ہوں گی [5] - البتہ جو چیز روپوں کے لیے بطور ظرف ہی متعین ہو مثلاً بٹوا، تو اس کے سرقہ کرنے پر اس کے ضمن میں حاصل ہونے والی رقم کو بھی نصاب سرقہ میں شامل کیا جائے گا [6]

۳ - اس مال کی چوری میں سرقہ موجبِ حد سے بچنے کی کسی معقول تاویل کی گنجائش نہ ہو [7]

۴ - مال بمقدار نصاب سرقہ ایک ہی مرتبہ ایک ہی محفوظ جگہ سے باہر نکالا گیا ہو [8]

توضیح: نصاب میں مجموعی مالیت کا اعتبار کس صورت میں کیا جائے گا اور کس صورت میں نہ کیا جائے گا؟ اگر مختلف محفوظ مقامات سے مال چوری کیا گیا ہو اور ہر جگہ سے سرقہ نصاب سے کم ہو لیکن سب کی مجموعی مالیت نصاب کو پہنچتی ہو، یا سرقہ تو ایک ہی محفوظ جگہ سے کیا گیا ہو، مگر مال کو تھوڑا تھوڑا کر کے محفوظ

---

[1] درمختار ص ۱۹۹ ج ۳ -

[2] ہدایہ و درمختار ص ۲۰۵ ج ۳ - امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان چیزوں کی مالیت تو ہے مگر اس کا نصاب کے اندر اعتبار نہ ہوگا - اور صاحبینؒ کے نزدیک ان اشیاء کی سرے سے کوئی مالیت ہی نہیں ہے - اسی پر فتویٰ ہے

[3] درمختار ص ۱۹۹ ج ۳ [4] درمختار ص ۱۹۹ ج ۳

[5] ہدایہ ص ۵۴۰ ج ۱ - بحر الرائق ص ۵۴ ج ۵ - درمختار ص ۱۹۹ ج ۳

[6] درمختار ص ۱۹۹ ج ۳ [7] درمختار ص ۲۰۵ ج ۳ [8] درمختار ص ۲۰۰ ج ۳

محفوظ مقام سے باہر کئی مرتبہ نکالا گیا ہو اور ہر مرتبہ نصاب سے کم نکالا گیا ہو، تو ان دونوں صورتوں میں مال کے مجموعے کو نصاب میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر محفوظ مال کو باہر نکالنے سے پہلے مکان کی چار دیواری وغیرہ کے اندر تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو جمع کیا گیا ہو پھر وہاں سے بقدر نصاب باہر نکالا گیا ہو تو ایسی صورت میں مجموعی مالیت کا اعتبار کیا جائے گا۔[1]

تشریح ۴ | حفاظت مال اور اس کی اقسام: مال کے محفوظ ہونے کی شرط خود مفہوم سرقہ سے واضح ہے اس لیے کہ "سرقہ محفوظ چیز کے چرانے کا نام ہے"[2]۔ چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔" وما کان من الجرین ففیه القطع اذا بلغ ثمن المجن"[3] یعنی جو چیز محفوظ جگہ سے نکالی گئی ہو اس کے چرانے پر قطع ہے۔ بشرطیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے " درخت پر لگے ہوئے پھلوں اور اس بکری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا جو پہاڑ پر بغیر محافظ کے پھرتی رہی۔ مگر جب بکری گھر آجائے یا پھل کاٹ کر کہیں خشک کرنے کو رکھا جائے تو پھر اُسے سرقہ کرنے پر قطع کی سزا ہوگی۔ بشرطیکہ مسروقہ مال کی قیمت ڈھال کے برابر ہو"[4]

مذکورہ دونوں حدیثوں سے واضح ہے کہ قطع کی سزا صرف اس صورت میں دی جائے گی جب کہ مال کو محفوظ مقام سے چرایا گیا ہو۔ علامہ ابن قدامہ نے مغنی کے اندر اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ حد سرقہ کے لیے ضروری ہے کہ مال محفوظ مقام سے چرایا گیا ہو۔[5]

مال کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ مال ایسی جگہ سے لیا گیا ہو جہاں دوسرے شخص کی آمد ورفت اجازت کے بغیر ممنوع ہو۔ گھر، خیمہ، دکان، بکریوں کا باڑہ، گھوڑوں کا اصطبل، صندوق

---

[1] در مختار ص ۲۰۰ ج ۳۔

[2] لما کان فی اسم السرقة ما ینبئ عن صفة الاحراز صارکون المال محرزا بالنص۔ المبسوط للسرخسی ص ۱۴۷ ج ۹ مطبوعہ مصر۔

[3] ابو داؤد [4] موطا امام محمدؒ۔

[5] المغنی ابن قدامہ ص ۲۴۸ ج ۸ مصر۔

اور جیب وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں[1]۔ اس قسم کے بارے میں فقہاء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ ایک طرح کے مال کی حفاظت کے لیے جو جگہ بنائی گئی ہو کیا وہی جگہ دوسری طرح کے مال کے لیے بھی محفوظ جگہ شمار ہوگی، یا ہر مال کی جائے حفاظت اپنی نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ طور پر ہوگی؟ اگرچہ بعض فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ جائے حفاظت ہر مال کے لیے اپنی نوعیت کی جداگانہ ہوگی، لیکن فتویٰ اس بات پر ہے کہ ایک قسم کے مال کے لیے جو جائے حفاظت ہوگی وہی باقی اقسام کے لیے بھی جائے حفاظت کہلائے گی۔ چنانچہ یہ حضرات بطور مثال فرماتے ہیں کہ اصطبل گھوڑوں کی حفاظت کی جگہ ہے، مگر یہی جگہ روپوں کے لیے بھی محفوظ جگہ ہوگی لہٰذا اس جگہ سے سرقہ کرنا محفوظ مقام سے سرقہ کرنا شمار کیا جائے گا[2]۔

حفاظت کا دوسرا طریقہ چوکیداری ہے۔ اگر مال کھلے مقام میں ہو، مگر چوکیدار کی نگرانی میں رکھا ہوا ہو تو یہ بھی محفوظ شمار ہوگا۔ اور حفاظت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ چوکیدار بیدار رہی ہو بلکہ مال کا چوکیدار کے قریب ہونا ضروری ہے۔ پھر اگر چوکیدار سو بھی جائے تو بھی مال چوکیدار کی حفاظت میں شمار ہوگا۔ چنانچہ حضرت صفوانؓ بن امیہ مسجد کے اندر چادر سر کے نیچے رکھ کر سوئے ہوئے تھے کہ وہاں سے چور لے گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر قطع کی سزا نافذ فرمائی تھی[3]۔

اگر مال حفاظت کی مذکورہ دونوں قسموں میں داخل نہ ہو تو اس سرقہ پر تعزیری سزا دی جائے گی لیکن حد نافذ نہ ہوگی۔ لہٰذا جو لوگ گھروں میں اجازت کے بغیر آمد و رفت کرتے ہوں جیسے گھروں کے ملازم وغیرہ، یا وہ لوگ جو گھروں میں اجازت سے داخل ہوئے ہوں جیسے مہمان، تو ان کے حق میں جگہ محفوظ نہ رہے گی۔ لہٰذا اگر ان لوگوں میں سے کوئی بقدر نصاب سرقہ کرلے تو حد نافذ نہ ہوگی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے درخواست کی کہ میرے غلام کا ہاتھ کاٹ دیجیے اس لیے کہ اس نے میری عورت کا شیشہ چرایا ہے جس کی قیمت ساٹھ درہم ہے، تو آپ نے فرمایا اس کے لیے قطع ید کی سزا نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ آپ کا خادم ہے جس نے آپ کا مال

---

[1] ہدایہ ج ۲ ص ۵۴۴ مطبوعہ اسلام کمپنی کراچی۔

[2] شامی ص ۲۰۹ ج ۳ اور بحر ص ۵۸ ج ۵ مطبوعہ دارالکتب العربیۃ الکبریٰ بیروت۔

[3] ہدایہ ص ۵۴۴ ج ۲ اور معین الحکام ص ۲۲۴۔

لیا ہے[۱]۔ یعنی اس کے حق میں چونکہ مال محفوظ نہیں ہے لہٰذا قطع ید کی سزا نہیں دی جا سکتی۔

تشریح ۵ | ۱۔ مال کا محفوظ جگہ سے اخراج - خفیہ طور پر مال کو محفوظ جگہ سے باہر نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ سارق اخذِ تام کے طور پر قابضِ مال کے علم اور رضا کے بغیر مال لے جائے[۲] اس کی چار صورتیں بنتی ہیں:

۱۔ مجرم کے خیال میں قابضِ مال کو اس کے فعل کا علم ہے، حالانکہ حقیقت میں اس کو علم نہیں ہے۔

۲۔ مجرم کے خیال میں قابضِ مال کو اس کے فعل کا علم نہیں ہے، حالانکہ حقیقت میں اس کو علم ہے۔

۳۔ دونوں کو ایک دوسرے کا علم نہیں ہے۔

۴۔ دونوں کو ایک دوسرے کا علم ہے[۳]۔

ان میں سے پہلی تین صورتیں موجبِ حد ہیں۔ پہلی اور تیسری میں فقہاء کا اتفاق ہے، البتہ دوسری صورت میں اختلاف ہے۔ لیکن ترجیح حد کے نفاذ کو دی گئی ہے اور قابضِ مال اور سارق میں سے کسی ایک کے عدم علم کو حد کے لیے کافی سمجھا گیا ہے[۴]۔

اور چوتھی صورت میں بھی اتفاق ہے کہ یہ موجبِ حد نہیں ہے۔ البتہ رات کو تکمیلِ جرم کے وقت اگر دونوں کو ایک دوسرے کا علم ہو جائے تو حد نافذ ہو گی[۵] بشرطیکہ سارق مال کا اخذ تام کرے۔

۲ - اخذِ تام ہونے کے لیے ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے:

۱۔ سارق مال کو جائے حفاظت سے باہر نکال لے۔

۲۔ قابضِ مال کی قیام گاہ سے بھی باہر نکال لے جائے۔

۳۔ مال، سارق کے قبضہ میں داخل ہو جائے[۶] اگر ان تینوں صورتوں میں سے کوئی امر رہ جائے تو حد نافذ نہ ہو گی۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص پیش کیا گیا جو نقب لگا کر مکان میں گھس گیا تھا۔

۱؎ مشکوٰۃ المصابیح ص ۳۱۴ والمغنی ص ۲۷۶ ج ۱۰

۲؎ التشریع الجنائی ص ۵۱۸ ج ۲   ۳؎ شامی ص ۱۹۹ ج ۳

۴؎ اکتفاء بکونہا خفیۃ فی زعم احدہما شامی ص ۱۹۹ ج ۳   ۵؎ ایضاً

۶؎ التشریع الجنائی الاسلامی ص ۵۱۸ ج ۲ والبحر الرائق ص ۵۹ ج ۵

مگر مال کو محفوظ جگہ سے باہر نکالنے سے قبل پکڑا گیا تو آپ نے اس کا ہاتھ نہیں کاٹا[۱] اسی طرح حضرت سلمان بن موسیٰ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چور کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اس پر اسی صورت میں قطع کی سزا عائد ہوگی جبکہ وہ سامان کو محفوظ جگہ سے منتقل کرے اور مکمل طور پر اس سے باہر نکال لانے[۲] حضرت عاصمؒ نے حضرت شعبی کا قول نقل کیا ہے کہ قطع کے لیے ضروری ہے کہ سارق سامان کو گھر سے باہر نکال لے[۳]۔

فقہاء نے ان صورتوں میں مال کو باہر نکالنے پر حد کے اجرا کو جائز نہیں رکھا:۔

۱۔ چور گھر میں نقب لگا کر گھس گیا پھر اس نے اندر سے مال دوسرے چور کو پکڑا دیا جو باہر کھڑا تھا۔

۲۔ سارق نے مکان کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے سامان پہلے جائے نقب پر رکھا پھر خود باہر نکلا اور باہر نکل کر سامان جائے نقب سے لے گیا۔

۳۔ اس نے سامان اندر سے باہر پھینکا جو اس کی نظر سے اوجھل ہوگیا[۴] البتہ اگر نظر سے غائب نہ ہوا ہو تو حد جاری ہوگی[۵]

پہلی صورت میں مکان کے اندر داخل ہونے والے نے حفاظت کو توڑنے کا فعل مجرمانہ کا اگرچہ ارتکاب کیا لیکن محفوظ جگہ سے باہر مال درحقیقت باہر والے نے نکالا ہے۔ اور باہر والے نے چونکہ مداخلت بیجا نہیں کی اس لیے اس پر بھی حد جاری نہ ہوگی۔ اور دوسری صورت میں جب اس نے جائے نقب سے سامان اُٹھایا تو درحقیقت اخذ تام اسی وقت ہوا لیکن اس وقت چونکہ مال محفوظ نہیں رہا تھا لہذا حد جاری نہ ہوگی۔ اور تیسری صورت میں مال جب سارق کی نظر سے غائب ہوگیا تو اس کا قبضہ اس پر نہ رہا۔ ایسی صورت میں اس پر مال کے نقصان کا تاوان عائد ہوگا مگر حد جاری نہ ہوگی۔

---

[۱] کتاب الخراج لابی یوسفؒ و مبسوط للسرخسی ص ۱۳۹ ج ۹

[۲] کتاب الخراج لابی یوسفؒ المصنف لعبدالرزاق ص ۱۹۶ ج ۱۰ مطبوعہ بیروت

[۳] کتاب الخراج لابی یوسف المصنف لعبدالرزاق ص ۱۹۶ ج ۱۰ مطبوعہ بیروت۔

[۴] منحۃ الخالق علی بحر ص ۶۰ ج ۵ مطبوعہ دار الکتب العربیۃ الکبریٰ [۵] ایضاً

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ حد اسی صورت میں عائد ہوگی جب کہ اخذ تام ہو جائے۔

۳ - اگر سرقہ دن کے وقت ہو تو اجراء حد کے لیے ضروری ہے کہ اقدام جرم سے لے کر تکمیل جرم تک مجرم کا فعل خفیہ رہا ہو۔ مغرب اور عشاء کا وقت بھی دن میں شامل ہوگا۔ کیونکہ اس وقت تک لوگ ابھی چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ اور اگر سرقہ رات کو ہو تو اقدام جرم کے وقت مجرم کے فعل کا خفیہ ہونا حد کے نفاذ کے لیے شرط ہے۔ البتہ اس صورت میں جرم کے مکمل ہونے تک خفیہ حالت کا باقی رہنا ضروری نہیں ہے[1]۔

۴ - اگر قابضِ مال کو مال لے جانے کا علم تو ہو مگر اس کی رضا نہ ہو تو اس صورت میں حد نافذ نہ ہوگی۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ خائن، چھین کر اور اچک کر لے جانے والے پر قطع نہیں ہے[2]۔ ابن شہاب زُہری سے روایت ہے کہ ایک شخص مروان بن حکم کے زمانے میں کسی کی چیز کو اچک کر لے گیا تو مروان نے اس کا ہاتھ کاٹنا چاہا۔ اس پر زید بن ثابتؓ اس کے پاس آئے اور اس سے بیان کیا کہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام محمدؒ نے کہا کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں کہ اُچکے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی قول ہے[3]۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ جو مال قابضِ مال کے علم میں اس کی رضا کے بغیر لیا جائے اس پر حد نافذ نہ ہوگی البتہ تعزیری سزا دی جائے گی۔

۵ - ایک سے زائد بار کا سرقہ۔ اگر سارق نے بقدر نصاب مال اخذ تام کے طور پر کئی بار محفوظ مقام یا مقامات سے سرقہ کیا ہو تو حد سب کی جانب سے ایک ہی ہوگی بشرطیکہ آخری سرقہ سے قبل اس پر پہلے سرقہ کی حد جاری نہ ہو چکی ہو ورنہ بعد کے سرقہ کی مستقل حد جاری ہوگی اور اجراء حد کے لیے یہ ضروری نہ ہوگا کہ جن لوگوں کا مال سرقہ ہوا ہے وہ سب مل کر نالش کریں بلکہ کسی بھی قابضِ مال کی نالش پر حد جاری ہو سکتی ہے جو سب قابضین مال کی جانب سے متصور ہوگی خواہ قابضین مال ایک ہی سرقہ سے متاثر ہونے والے افراد ہوں یا متعدد سرقات کے متعدد افراد ہوں[4]۔

---

[1] (خفیۃ) ابتداءً وانتہاءً لو الاخذ نہارًا ومنہ ما بین العشائین وابتداءً فقط لو لیلا در مختار ص ۱۹۹ ج ۳ [2] مشکوٰۃ [3] مؤطا امام محمدؒ ص ۳۱۴۔

[4] ہدایہ ۵۵۳ ج ۲ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی۔

۶ - ایک سے زائد افراد کا سرقہ - اگر حرز سے مال ایک سے زائد افراد نے نکالا ہو تو حد سرقہ سب پر نافذ ہو گی بشرطیکہ مال ہر ایک کے حصہ میں بمقدار نصاب آتا ہو[1] اور وہ معلوم بھی ہوں - نیز یہ کہ ان میں کوئی غیر مکلف اور قابض مال کا کوئی قریبی رشتہ دار نہ ہو[2] - ورنہ سب کو تعزیر کی سزا دی جائے گی[3] اور ان کو اظہار توبہ تک قید بھی رکھا جائے گا[4]

۷ - اخراج مال کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک مال کو خود حرز سے باہر لائے بلکہ اگر وہ ایک آدمی کی پشت پر لاد کر باہر لاتے ہیں تو یہ بھی سب کی جانب سے جرم تصور ہو گا -

۸ - اگر حرز سے سامان باہر نکالنے کے بعد بعض چور غائب ہو جائیں اور بعض پکڑے جائیں اور گواہ سب کے بارے میں سرقہ کرنے کی گواہی دیں تو حاضر مجرموں پر حد جاری کی جائے گی اور غائب اگر پکڑے جائیں تو یہی گواہ یا دیگر گواہ دوبارہ ان ملزموں کے سامنے پھر سے گواہی دیں گے تو حد جاری ہو گی ورنہ نہیں[5]

(باقی)

---

[1] شامی ص ۲۰۳ ج ۳ [2] معین الحکام ص ۲۲۳ ہدایہ ص ۵۳۵ ج ۲

[3] المبسوط ص ۱۴۹ ج ۹ [4] شامی [5] شامی ص ۱۹۸ ج ۳

[6] التشریع الجنائی الاسلامی ص ۶۱۲ ج ۲

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے چند جذباتی لمحات

عبدالحمید صدیقی

شعور کی طرح جذبہ انسانی زندگی کے لیے خداوند تعالیٰ کی ایک مستقل اور لازوال نعمت ہے۔ جب تک انسان سانس لیتا ہے جذبہ بھی اس کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ البتہ اس کی کیفیات، حالات، ماحول اور مزاج کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ ہلکی سی لے کی طرح انسان کے اندر ارتعاش پیدا کرتا ہے، کبھی یہ شدت اختیار کر کے اس کی زندگی میں زلزلہ اور طوفان اٹھاتا ہے، کبھی روحانی کیف و مستی کے زیر اثر آکر قلندرانہ وجد و حال کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے، کبھی یہ ایسی خاموش اور پرسکون روش اختیار کر لیتا ہے کہ اس کی حرکت و حرارت کا احساس تک نہیں ہوتا، لیکن یہ کسی نہ کسی صورت میں بہرطور موجود ضرور رہتا ہے۔

جب ایک عام انسان کے جذبے اور اس کی کیفیت کا صحیح ادراک بسا اوقات انسانی دسترس سے باہر ہوتا ہے تو آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ افضل الانبیاء، ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبات کا احاطہ کیا جاسکے؟ اس بنا پر اس مضمون کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسیاتی تجزیے کی قسم کی کوئی بے جا جسارت نہ سمجھا جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شعور اور جذبات کا صحیح تجزیہ کسی انسان کے بس کی بات ہے بھی نہیں۔ انسانی نفسیات کا مبتدی بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ یہ تجزیہ اسی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ انسانوں کے مابین مشترک جذبات ہونے کی وجہ سے ان کے اظہار کے راستے بھی ایک دوسرے سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ اس لیے کسی دوسرے شخص کا جذباتی طرزِ عمل دیکھ کر ہم اپنے دل کے اندر جھانکتے ہیں اور ان محرکات کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں بھی اسی نوعیت کے طرزِ عمل کو جنم دیتے ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور

اُس کی صحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے اعمال میں ہم آہنگی ہو۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ مماثلت اور ہم آہنگی نبی اور غیر نبی کے محرکات و اعمال کے مابین تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ غیر نبی کے محرکاتِ عمل میں تو دنیوی آلائشیں بھی ہو سکتی ہیں جب کہ نبی کے محرکات بالکل پاکیزہ اور مُنزّہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خود اُن کے ان مصفا چشموں کی حفاظت کا انتظام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک عام انسان غصے کا اظہار کرتا ہے تو بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی انا کو کوئی ٹھیس پہنچی ہے یا اُس کے کسی مفاد پر کوئی ضرب لگی ہے۔ اس لیے ہم ان وجوہ پر غور کر کے اصل تحریکات کا کسی حد تک ادراک کر لیتے ہیں کیونکہ ہم خود بھی اس قسم کے حوادث سے دوچار ہو کر برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن نبی کی رنجش کے اسباب چونکہ عام انسانوں کے وجوہِ ناراضی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس لیے کوئی غیر نبی اُن کا صحیح طور پر احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان نے جو نبوت کے ارفع مقام کا کچھ بھی شعور رکھتا ہے، کسی نبی کے نفسیاتی تجزیہ کی ہمت نہیں کی۔ موجودہ دور کے نفسیات گزیدہ اپنے خبثِ باطن کو علم و تحقیق کے نام پر جس طرح چاہیں ظاہر کرتے رہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی نبی کا نفسیاتی تجزیہ بارگاہِ نبوت میں انتہائی گستاخانہ عمل ہے، کیونکہ یہ تجزیہ کرنے والا اپنے آپ کو حَکَم سمجھ کر اِس مہم کا آغاز کرتا ہے۔ کیا کوئی مسلمان اِس زعم میں گرفتار ہو سکتا ہے کہ وہ نفس کی انگیخت اور شیطان کے وسوسوں سے مکمل طور پر بچ کر، کسی نبی کی نفسیاتی کیفیات اور اُس کے عمل کے محرکات کا پوری طرح ادراک کر کے مکمل عدل و انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ کوئی حکم لگا سکتا ہے؟ ایک مسلمان تو اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ "تحقیق" غارت گرِ ایمان ہے۔

ایک عام انسان اور نبی کے ارفع مقام کے درمیان جو امتیاز ہے، اُسے تسلیم کر لینے کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نبی چونکہ نوعِ بشری کی رشد و ہدایت کے لیے مامور ہوتا ہے اِس لیے اس کا تعلق بنی نوعِ انسان ہی سے ہوتا ہے اور وہ انسانی داعیات کے ساتھ ہی انسانی معاشرے کے اندر اپنے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ غم کے لمحات میں وہ دل گرفتہ اور بے چین ہوتا ہے، خوشی کے مواقع پر اس کا دل راحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے، اعدائے دین کی چیرہ دستیاں اور دل آزاریاں اور راہِ حق سے انحراف کے لیے اُن کی ہٹ دھرمیاں اُسے رنجیدہ اور مغموم کرتی ہیں۔ رفقا کی کوتاہیوں پر وہ ناگواری کا اظہار کرتا ہے اور اُن کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر مسرور ہوتا ہے۔ الغرض بھوک،

پیاس، علالت، عزیزوں اور دوستوں کی وفات، زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز، پریشانیاں اور المیے اُسے دوسرے انسانوں کی طرح ہی متاثر کرتے ہیں اگر ان اثرات کے ہجوم میں بھی وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو اُس کے عظیم مرتبے سے فروتر ہو۔ وہ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی سیرت و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے اور اُس مثالی طرزِ عمل کا اظہار کرتا ہے جس کا حکم اُسے مالکِ کائنات نے دیا ہے۔ چنانچہ وہ خوشی کے موقع پر پُرجوش تو ہوتا ہے مگر لہو و لعب میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے خالق کے سامنے سجدۂ شکر بجا لاتا ہے جس نے اُس کے لیے مسرت و شادمانی کا سامان پیدا کیا۔ اسی طرح وہ دکھ اور مصائب میں رنجیدہ خاطر تو ہوتا ہے مگر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا بلکہ اُس قادرِ مطلق کی طرف رجوع کرتا ہے جو ناخوشگوار حالات پیدا کرنے اور تنگی کو فراخی میں بدلنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

جس طرح عقل کو زندگی سے خارج کر کے محض جذبات کے سہارے زندہ رہنا فطرت کے خلاف جنگ ہے، اسی طرح حیاتِ انسانی کو جذبات سے محروم کر کے یا انہیں پوری طرح دبا کر جیسا کہ رواقیوں (STOICS) نے کیا، محض شعور اور آگہی کے بل بوتے پر زندگی بسر کرنا انسانی جان کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہے۔ شعور و جذبہ دونوں کا زندگی میں اپنا اپنا مقام اور کردار ہے اور دونوں کے حسین امتزاج ہی سے زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ اور دلآویز زندگی کے جذباتی لمحات میں آپؐ کے خدا پرستانہ طرزِ عمل کی چند جھلکیاں دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ محترمہ اور جدِ امجد کی وفات پر جس طرح دلگیر ہو کر آنسو بہائے اُس سے آپؐ کے جذبات کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر غارِ حرا میں جب جبرائیل امینؑ وحی لے کر پہلی بار حضورؐ کے سامنے ایک نورانی پیکر میں نمودار ہوئے تو آپؐ قدرتی طور پر خوفزدہ ہوئے کیونکہ آپؐ اُن کی ذات سے پہلے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ آپؐ گھبراہٹ کے عالم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گھر تشریف لائے اور انہیں فرمایا "زَمِّلُوْنِیْ" (مجھے کچھ اڑھاؤ)۔ جب کچھ دیر کے بعد گھبراہٹ دور ہوئی تو آپؐ نے اپنی رفیقۂ حیاتؓ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ یہ سن کر اُن سعادت مند خاتون نے، جو آپؐ کے اوصافِ حمیدہ سے پوری طرح واقف اور آپؐ کی عظمت کی سب سے زیادہ معترف تھیں، یہ کہہ کر آپؐ کو تسلی دی۔

"آپ ہرگز خوفزدہ نہ ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ خدا کی قسم مالک الملک آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرنے والے، راست گو، لوگوں کے بار اٹھانے والے، ناداروں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والے ہیں۔ آپ امین ہیں اور مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہیں اور نامساعد حالات میں لوگوں کی اعانت اور دستگیری کرتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

جب آپ نے حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا تو ہر طرف سے آپ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لیکن آپ خداوند تعالیٰ کی تائید کے سہارے پورے صبر و ثبات کے ساتھ یہ فرض سرانجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس اثنا میں ایک نازک مرحلہ ایسا بھی آیا، جس میں حضورؐ کے مربی اور کفیل جناب ابوطالب بھی قریش کے دباؤ کے تحت اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ دین کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ حضورؐ کی زندگی کے جذباتی لمحات میں یہ ایک نہایت ہی نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی مخالفت اور مخاصمت تھی اور دوسری طرف وسائل کی کمی اور پیارے چچا، جو دنیاوی سہاروں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد طاقت ور سہارا تھے، کی مجبوریاں تھیں۔ ان صبر آزما لمحات میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر آپؐ اپنے چچا کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیتے تو آپ کی حفاظت اور کفالت سے محروم ہو جاتے اور پھر آپؐ کو قریش کی دراز دستیوں سے بچانے والی کوئی مؤثر شخصیت اس معاشرے میں باقی نہ رہتی۔ ابن ہشام میں اس واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے۔ جب قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی سرگرمیوں پر، اور ان سے جو نقصان ان کے آبائی دین کو پہنچ رہا تھا، اس پر جناب ابوطالب سے شکایت کی تو انہوں نے حضورؐ کو بلایا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا:

"اے جانِ برادر! تمہارے قبیلے کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھ سے اس طرح کی باتیں کیں (اور وہ باتیں بیان کیں جو انہوں نے کہی تھیں) خدارا مجھ پر رحم کرو اور خود اپنی جان پر بھی رحم کرو۔ مجھ پر ایسا بار نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا"

راوی کا گمان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ ایسا احساس ہوا کہ ان کے چچا ان کی دستگیری سے اب مجبوراً دست کش ہو رہے ہیں اور ظالموں اور آپؐ کے درمیان وہ حائل نہ رہیں گے۔ حضورؐ کی زندگی کا یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ایک طرف کفر کی طاقت اور عداوت تھی تو دوسری طرف دنیوی اعتبار سے بے بسی اور بے سروسامانی۔ ان حالات میں جو واحد سہارا تھا وہ بھی اب ہمت ہار کر الگ ہوتا نظر آ رہا

تھا۔ حضورؐ نے اس اندوہناک صورتِ حال کو شدت سے محسوس کیا اور آپؐ کا دل بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا لیکن غم و اندوہ کے ان لمحات میں بھی آپؐ نے خداوند تعالیٰ کے سہارے ہی کو اپنے لیے سب سے زیادہ مضبوط سہارا سمجھا اور جزم و یقین کے ساتھ فرمایا:

يَا عَمِّ وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ	چچا جان! قسم ہے خدا کی اگر یہ لوگ میرے دائیں
فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي	ہاتھ پر سورج بھی رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پہ چاند، اور
عَلٰى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى	مجھ سے اس کام سے باز رہنے (کا مطالبہ) کریں تو
يُظْهِرَهُ اللّٰهُ اَوْ اَهْلِكَ	میں اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اسے
فِيْهِ مَا تَرَكْتُهُ	غالب کر دے یا میں (اس جدوجہد) میں اپنی جان
ابن ھشام جلد ۱ ص ۲۶۶	جان آفریں کے حوالے کر دوں۔

جناب ابوطالب حضورؐ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے بڑے متاثر ہوئے اور کہا: "جانِ عزیز! جہاں جس طرح تمہارا جی چاہتا ہے دعوتِ دین کا کام کرتے رہو۔ میں تمہاری معاونت سے کبھی دست بردار نہ ہوں گا۔"

حضورؐ نے اپنے چچا کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا۔ دنیاوی معاملات میں بڑی خوش دلی سے اُن کا ہاتھ بٹایا، روپے پیسے سے اُن کی مدد کی، اُن کے بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دی، اُن کے سامنے ہر موزوں موقع پر دین کی دعوت پیش کی تاکہ وہ مسلمان ہو کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔ حضورؐ اپنے چچا کی آخرت سنوارنے کے بارے میں کس قدر فکر مند تھے، اس کا اندازہ حضورؐ کی اُس پُرزور التجا اور دُعا سے لگایا جاسکتا ہے جو آپؐ نے جناب ابوطالب کی وفات کے وقت اُن کے سامنے کی اور اُن کی وفات کے بعد خدا کے حضور میں اُن کی مغفرت کے لیے کرتے رہے۔ اس التجا اور دُعا میں حضورؐ کے اپنے چچا کے بارے میں جذبات کی اچھی طرح عکاسی ہوتی ہے۔

مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں ہے کہ جب جناب ابوطالب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس تشریف لے گئے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن اُمیہ بھی وہاں موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا چچا جان، آپ ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ تو کہہ دیجیے تاکہ مجھے خدا کے سامنے آپ کی شفاعت اور سفارش کے لیے ایک حجت اور دلیل مل جائے۔ ابوجہل اور عبداللہ بن ابی اُمیہ باپ کے

دین کا واسطہ دے کر انہیں کلمہ شہادت پڑھنے سے تاکیداً باز رکھتے رہے اور حضورؐ بار بار انہیں زبان سے کلمۂ شہادت ادا کرنے کی التجا کرتے رہے۔ مگر وہ نہ مانے اور انہوں نے عبدالمطلب ہی کے دین پر دُنیا سے رخصت ہونا پسند کیا۔ اُن کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا کے لیے مسلسل دُعائے مغفرت مانگتے رہے یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔

حضورؐ اپنی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی بڑا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ اُن کی معاونت اور دستگیری کو حضورؐ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ جب انہوں نے وفات پائی تو آپ بڑے آزردہ خاطر ہوئے۔ ان کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد حضورؐ کے دل میں اُن کی محبت اور احترام آخری دم تک موجود رہا۔ جب کبھی اُن کا ذکر آتا تو آپؐ مغموم ہو جاتے اور بسا اوقات آپؐ کے جذبات خلیجِ چشم سے آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلتے۔ جب کبھی اُن کی کوئی چیز سامنے آتی تو آپؐ کا دل بھر آتا۔ حضرت ابوالعاص جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھانجے اور داماد تھے جنگ بدر میں گرفتار ہوئے اور اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ روانہ کیا تو حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابوالعاص کے فدیے میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شادی کے وقت انہیں دیا تھا۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُس ہار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور صحابہؓ سے فرمایا: "اگر مناسب سمجھو تو اس ہار کو واپس کر دو اور اس قیدی کو چھوڑ دو۔" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے کہ مجھے حضورؐ کی ازواجِ مطہرات میں کسی اور زوجۂ محترمہ پر اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر۔ حضورؐ اُن کی سہیلیوں کو وقتاً فوقتاً تحائف بھیجتے اور ان کا کثرت سے تذکرہ فرماتے۔ ایک مرتبہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے "آپ کے دل و دماغ پہ تو خدیجہؓ ہی چھائی رہتی ہیں"۔ اس پر آپؐ رنجیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا: "ہاں اُن کی محبت کی خود اللہ نے میرے دل میں آبیاری کی ہے۔ وہ مجھ پر اُس وقت ایمان لائیں جب دوسرے لوگوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ جب لوگوں نے میرے دعوئے نبوت کو جھٹلایا تو انہوں نے میری تصدیق کی۔ جب دوسرے لوگوں نے مجھے ہر چیز سے محروم رکھنے کی کوشش کی تو انہوں نے میری دست گیری کی[1]۔"

جناب ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات سے حضورؐ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ

[1] یہ الفاظ بخاری، مسلم اور مسند احمد بن حنبلؒ سے جمع کیے گئے ہیں۔

آپ نے ان کے سالِ وفات کا نام ہی عام الحزن رکھ دیا تھا۔ لیکن ان المناک حوادث سے دوچار ہونے کے باوجود آپ دعوتِ دین کے لیے پا پیادہ ہی مکے سے نکل کھڑے ہوئے اور طائف تک راستے میں جتنے قبائل آباد تھے سب کو اللہ کا پیغام سناتے چلے گئے۔ طائف پہنچنے پر آپ وہاں کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب سے ملے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ اُن میں سے ایک بولا: میں کعبہ کے سامنے داڑھی منڈوا دوں گا اگر اللہ نے تجھے رسول بنایا ہو۔ دوسرے نے کہا: کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور رسول بنانے کو نہ ملا جس کو سواری تک میسر نہیں۔ اُسے اگر رسول بنانا ہی تھا تو کسی حاکم اور سردار کو بناتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس طعنہ زنی اور بے ہودہ باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور تبلیغ دین میں برابر منہمک رہے۔ اس سے یہ سردار جھلا اُٹھے اور انہوں نے شہر کے چھوکروں اور اوباش لوگوں لوگوں کو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ اور زچ کرنے پر اُکسایا۔ چنانچہ عقل کے اِن اندھوں نے آپ کو گالیاں دیں، تالیاں پیٹیں اور آپ پر پتھر پھینکے۔ آپ اِس سنگ باری کے باعث لہو سے تر بتر ہوگئے۔ خون بہہ بہہ کر جوتوں میں جم گیا اور وضو کے لیے پاؤں جوتے سے نکالنا مشکل ہوگیا۔ اس سفر میں آپ کو بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ایک شخص بھی مسلمان نہ ہوا۔ اِن حوصلہ شکن حالات میں جب ایک مقدس ہستی بھٹکے ہوئے لوگوں کو حق کی راہ دکھا رہی ہو اور وہ اس کے بدلے میں گالیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کر رہے ہوں اور اس کی زندگی کے درپے ہوں، انسان کے دل پر جو گزرتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ آدمی رنجیدہ خاطر ہوتا ہے، اس ظلم کے خلاف اُس کے دل سے آہ نکلتی ہے، وہ ظالموں کو کوستا ہے اور انسان اس انداز پر سوچنے لگتا ہے کہ کیوں نہ حق کے اِن باغیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور خدائی فیصلے کا انتظار کیا جائے؟ مگر اِن حالات میں بھی رحمۃ للعالمینؐ نہ تو برہم ہوئے نہ مایوس بلکہ اپنے رب کے حضور یوں دُعاگو ہوئے:

اللھم الیک اشکو ضعف	الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی
قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی	تحقیر پر تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔ تو سب
علی الناس یا ارحم الراحمین	رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے
انت ربّ المستضعفین وانت	درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے۔ اور میرا مالک

سابی - إلی من تکلنی ؟ إلی بعید یتجھمنی ؟ ام إلی عدو ملکتہ امری ؟ إن لم یکن بک غضب علیّ فلا اُبالی غیر ان عافیتک ھی اوسع لی - اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت لہ الظلمت وصلح علیہ امر الدنیا والاٰخرۃ : ان یحلّ علیّ غضبک او ان ینزل بی سخطک - لک العُتبیٰ حتی ترضی ولا حول ولا قوۃ إلا بک -

زاد المعاد جلد ۲ ص ۱۲۴ - ۱۲۳ -

بھی تو ہی ہے ۔ مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے ؟ کیا کسی بیگانے کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آئے ؟ یا کسی دشمن کو تونے میرے اوپر قابو دے رکھا ہے ؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے پھر کسی چیز کی پروا نہیں ۔ لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے ۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں ۔ میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر اُترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو ۔ مجھے تیری ہی رضا اور خوشنودی درکار ہے ۔ اور کوئی طاقت تیری طاقت کے سوا نہیں ہے ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر غمگین و رنجیدہ دیکھ کر جبرائیل امین تشریف لائے اور کہا : آپ کی قوم نے آپ سے جو ناروا سلوک کیا ہے اللہ نے اُسے دیکھ لیا ہے ۔ اگر آپ چاہیں تو ان ظالموں کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے ۔ لیکن اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب دیا کہ :

" نہیں ۔ ایسا ہرگز نہ کیا جائے ۔ مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ مولائے کریم ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے "۔

(زاد المعاد از ابنِ قیم جلد دوم ص ۱۲۴)

رحمۃ للعالمین کی مولہ بالا دُعا اور دینِ حق کے دشمنوں اور اپنے خون کے پیاسوں کے بارے میں آپ کی یہ سفارش دونوں اتنی اثر انگیز ہیں جن سے آپ کی ذاتِ اقدس سے سخت کد رکھنے والا عیسائی سوانح نگار ولیم میور بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اُسے مجبوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صداقت

کا یوں اعتراف کرنا پڑا۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس انداز سے طائف کی طرف روانہ ہوئے وہ عظمت اور حوصلہ مندی کی تصویر ہے۔ ایک تنہا اور بے یار و مددگار شخص جسے اپنے اقرباء تک نے نفرت و حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا ہو، کمال جرأت کے ساتھ خداوند تعالیٰ کے بھروسے پر اسی شان کے ساتھ طائف کی طرف روانہ ہوتا ہے جس طرح یونس بن متی نے نینوا کی طرف رخت سفر باندھا تھا۔ اہل شہر کو جو شرک و کفر میں پوری طرح ملوث تھے رجوع الی اللہ اور اپنے مشن کی حمایت کی دعوت دیتا ہے۔ اس امر سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اُن کو اپنے مامور من اللہ ہونے پر پورا اعتماد اور یقین تھا۔"[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال تک محصور رہے اور اس مدت میں قریش نے جس طرح اُن پر عرصہ حیات تنگ کیا وہ ایک دل ہلا دینے والی داستان ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خداداد بصیرت کے ذریعہ رنج و محن کے ان سالوں کو بھی تربیت کا دور بنا دیا۔ اور شعبِ ابی طالب کی تربیت گاہ میں ساتھیوں کی اچھی طرح تربیت کی تاکہ مستقبل قریب میں انہیں جس قسم کی مشکلات پیش آنے والی ہیں وہ اُن سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکیں، جو ہستی بھوک، پیاس، معاشرتی مقاطعہ اور قید کے لرزہ خیز مصائب کے اندر اپنے رفقاء کے حوصلے بلند رکھنے کا التزام کرتی ہے اور ان کے ذریعہ اُن میں سیرت و کردار کی پختگی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے، وہ کس قدر عظیم ہوگی؟

قریش نے جب یہ دیکھا کہ حضورؐ اور آپ کے فدائیوں کے خلاف ترغیب و ترہیب کا کوئی ہتھیار کارگر ثابت نہیں ہو رہا اور دعوتِ دین کا کام اُن کی ساری ستم رانیوں کے باوجود مسلسل آگے بڑھ رہا ہے تو وہ حضورؐ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اِدھر حضورؐ سرورِ دو عالم نے بھی حالات کی نزاکت کو پوری طرح بھانپ لیا اور یہ محسوس کر لیا کہ سرزمینِ مکہ دینِ حق کو ایک اجتماعی قوت میں ڈھلنے کے لیے موزوں نہیں، اس کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کفارِ مکہ

[1] لائف آف محمدؐ ص ۱۰۹

کو بھی آپ کے اس ارادے کا علم ہوگیا اور انہوں نے ہر قبیلہ کے ایک ایک آدمی کو جمع کرکے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایک ساتھ حملہ کرکے (معاذ اللہ) ان کا کام تمام کردیں تاکہ وہ سرچشمۂ عرفان ہی باقی نہ رہے۔ جبرائیل امین کے ذریعہ حضورؐ کو بھی اُن کے اِن ناپاک عزائم کی اطلاع ہوگئی۔ جس رات حضورؐ نے مکہ چھوڑنے کا ارادہ کیا وہی رات اعدائے دین نے حضورؐ پہ قاتلانہ حملے کے لیے منتخب کی۔ اِن حالات میں حضورؐ کی جذباتی کیفیت پہ غور کریں۔ جس سرزمین میں آپؐ نے جنم لیا، عہدِ طفولیت گزارا، جوان ہوئے، رشتۂ مناکحت استوار کیا، نبوت سے سرفراز فرمائے گئے اور جس میں قدم قدم پہ آپؐ کے بزرگوں کی یادگاریں موجود تھیں اور سب سے بڑھ کر جو خطۂ ارضی بیت اللہ کی موجودگی کی وجہ سے روحانیت کا مرکز و محور تھا، اُسے حضورؐ محض خالقِ کائنات کی خوشنودی کی خاطر خیرباد کہہ کر ایک اجنبی جگہ اور اجنبی ماحول میں آباد ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ مکہ کو الوداع کہتے ہوئے حضورؐ کی قلبی کیفیت کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ نے اس موقع پہ ارشاد فرمائے۔

وَاللّٰہِ انک لخیر ارض اللہ	خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے
واحب ارضٍ الی اللہ ولولا	اور سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب
انی اُخرجت عنکِ ما خرجت	ہے۔ اگر میں نکالا نہ جاتا تو کبھی نہ نکلتا۔

(ترمذی)

ما اطیبک من بلد و	تو کیا ہی پاکیزہ شہر ہے اور مجھ کو بڑا ہی
احبّک اِلَیّ ولولا ان قومی	محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھ کو نہ نکالتی تو
اخرجونی ما سکنت غیرک	میں دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔

(احمد و ترمذی)

پھر شہر سے نکلنا بھی انتہائی پُرخطر تھا۔ خوابگاہ کو خون کے پیاسوں نے اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ کوئی جائے فرار نہ تھی۔ الغرض ہر طرف آلام اور تفکرات ہی تھے۔ گھر بار چھوڑنے کا غم، قرابتداروں کی جدائی کا غم، اپنے کمزور اور بے بس جان نثاروں کے ظالموں کی تحویل میں رہ جانے کا غم، بیت اللہ سے بُعد اور دوری کا غم اور دشمنوں کی ناپاک سازشوں کی وجہ سے مختلف قسم

کی پریشانیاں اور اندیشے لاحق تھے۔ اس قسم کے المناک حالات میں بھی اللہ کے برگزیدہ نبیؐ نے سکونِ خاطر برقرار رکھا۔ اس آپؐ کے پاس جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں انہیں اپنے عم زاد بھائی کے ذریعہ ان کے مالکوں تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام فرمایا اور بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ اپنے فدائی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ قریش کو جب اپنے منصوبے کی ناکامی کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کے تعاقب میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے حتیٰ کہ وہ ایک غار کے دہانے تک جا پہنچے جہاں آپ پناہ گزین تھے۔ اس اثناء میں آپؐ کے جان نثار رفیقؓ نے گھبرا کر کہا: "حضورؐ، ان میں سے اگر کسی کی نظر اپنے قدموں پر پڑ جائے تو ہم اس کی نگاہ سے بچ نہ سکیں گے۔" آپؐ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:۔

یا ابا بکر ما ظنک باثنین اللہ ثالثھما۔	اے ابوبکر ان دو آدمیوں کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا:

لا تحزن ان اللہ معنا	تو بالکل غم نہ کھا یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(باقی)

روداد ابتلاء، احمد رائف مصری

جناب خلیل الحامدی صاحب

(۸)

ابو زعبل میں خفیہ پولیس نے تعذیب و تشدد کے جو وسائل و آلات شہر والوں کے خلاف استعمال کیے ہیں، وہ استبداد و تشدد کے لحاظ سے ان تمام وسائل سے فوقیت لے گئے ہیں جو رومیوں اور فارسیوں نے اپنے دَور میں استعمال کیے ہیں۔ یا عیسائیوں نے مذہبی استبداد اور "تحقیقاتی عدالتوں" کے دَور میں اختیار کیے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں مَیں نے یہ باتیں پڑھی تھیں۔ لیکن میں نے ذاتی طور پہ جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ ان تمام باتوں سے سراسر مختلف ہے جو میں نے پڑھی ہیں۔ میرا تجربہ درندگی، انسانیت سوزی اور تشدد و تذلیل میں تاریخ کے تمام تجربات سے فوقیت لے گیا۔

ابھی گرفتاری کے پہلے ہی روز ایک فوجی افسر مجھ سے دلیل و منطق کے انداز میں بات کرتے ہوئے کہنے لگا:

سُنا ہے آپ تعلیم یافتہ، مطالعہ کے رسیا اور ہر دم تازہ معلومات سے بہرہ مند رہنے والے ہیں۔

راقم: امید ہے میری یہ خوبی آپ کے جذبۂ رحم کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔

افسر: جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ کوئی تعرض نہ کروں گا۔ خواہ کیسا ہی قوی اور ٹھوس ثبوت موجود ہو۔ میرے لیے کسی انسان کو مارنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن کیا آپ نے یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں کے بارے میں کچھ پڑھ رکھا ہے؟

راقم: جی ہاں۔

افسر (انتہائی غم انگیز آواز کے ساتھ) یہاں آپ جس چیز کا مشاہدہ کرنے والے ہیں وہ شدت کے لحاظ سے اُن تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے جو آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔

راقم: کیا میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جانے والا ہے؟

افسر: آپ کو کیوں مستثنیٰ قرار دیں گے؟

راقم: کیا کوئی اپیل یا دلیل میرے کام نہ آئے گی؟

افسر: خود خدا بھی اب تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

اس افسر نے سانپ کی پھنکار کے ساتھ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا: "یہ وہ جگہ ہے جہاں خدا بھی داخل نہیں ہوتا۔ اور نہ خدا اس کے بارے میں کوئی علم رکھتا ہے (معاذ اللہ)۔ میری یہ بات کہاں تک سچی ہے یہ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا"۔

راقم: پھر میں کیا کروں؟

افسر: بولتے رہو، اور جو کچھ جانتے ہو بتاتے جاؤ۔ ہر چیز بیان کر ڈالو۔ یعنی سازش کیا تھی اور سازشیوں کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔

راقم: لیکن سازش وغیرہ کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

افسر: یہ بیکار بات ہے۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ سازش ہوئی ہے۔

الغرض جو شخص بھی اس جگہ داخل ہو جاتا تھا ——— جہاں معاذ اللہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق خود خدا بھی داخل نہیں ہوتا ——— اُس کے لیے لازم تھا کہ وہ حکومت کا غدار اور اس کے خلاف سازش کرنے والا بنے۔ اور اگر وہ سازشی نہیں بننا چاہتا تو پھر اسے تحقیق و تفتیش کے نام پر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہوگا، اور خدا ہی جانتا ہے کہ پھر اس تحقیق و تفتیش کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

مذکورہ بالا افسر نے مجھ سے ایک بات سچی کہی اور دوسری جھوٹی۔ اس کی یہ بات سچی تھی کہ میں تعذیب کا جو انداز دیکھنے والا ہوں وہ قرونِ وسطیٰ کی "تحقیقاتی عدالتوں" کے مظالم سے بھی بڑھ کر ہے۔ فی الواقع میں نے آنے والے سنگین و گراں ایام میں اس بات کا مشاہدہ اور تجربہ کر لیا ——— تعذیب اس قدر شدید کہ اکثر لوگ ہر لمحہ موت کی آرزو کرتے۔ نفسیاتی عذاب ایسا کہ میں نے بارہا لوگوں کو تازیانے کی ایک خفیف ضرب سے دم توڑتے دیکھا۔ ان مناظر نے خود میرے دل و دماغ کو پامال اور جسم و جان کو مضمحل کر کے رکھ دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بے گناہ ہیں۔ ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی تھے جو بڑے عالی حوصلہ تھے۔ اور بعض تو اس قدر کڑے نکلے کہ تعذیب و توہین کے باوجود جلادوں کے ساتھ استہزاء و تمسخر کر رہے ہوتے حالانکہ

ان کے اور موت کے درمیان صرف چند لمحات کا فاصلہ رہ چکا تھا۔

اُس کی یہ بات جھوٹ تھی کہ " اس جگہ خدا بھی داخل نہیں ہوتا۔ اور اس جگہ کا خدا کو بھی علم نہیں ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ خداوند تعالٰے کی ذات وہاں موجود تھی۔ میں نے خود بارہا خوف و دہشت کے تاریک سائے کے اندر اس ذات بابرکات کا دیدار کیا۔ بلکہ میں کہوں گا کہ اللہ تعالٰے کی حقیقی معرفت مجھے پہلے حاصل نہ تھی۔ یہ مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب مجھے اُس مقام پر لے جایا جاتا رہا تھا جو زندگی کے آخری کنارے پر واقع ہے۔

ابوزعبل کی جیل میں زرعی انجینئر ایم۔ این۔ زیڈ بھی موجود تھے۔ ایک عرصہ سے میری ان سے شناسائی تھی۔ گو تعلقات معمولی اور سطحی تھے۔ یہ میرے دوست م، غ کے پاس رہتے تھے۔ جن کے ہاں میں کبھی کبھار آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ سب حضرات زرعی کالج کے گریجویٹ تھے۔ اور ان کا تعلق یحییٰ حسین کے گروپ سے تھا۔ زرعی کالج کا بڑا بدقسمت گروپ! گردش احوال نے ان کے درمیان مفارقت پیدا کر دی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے معاملات میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ میری اور م۔ غ کی سر راہ اتفاقیہ طور پر انجینئر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اُس وقت ہم دونوں محلہ زیتونہ میں شام کو چہل قدمی کر رہے تھے۔ خوب ملاقات رہی۔ محبت و شوق کا تبادلہ ہوا۔ اور دُعا و سلام پر باہم جدا ہوئے۔ اُس ملاقات میں ہمیں معلوم ہوا کہ انجینئر صاحب سوہاج کے صوبے میں صوبائی محکمہ زراعت میں ملازمت کر چکے ہیں۔ ان کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے کاغذ کے ایک پرزے پر اپنا نام اور پتہ لکھا۔ اور اپنے دوست م۔ غ کو دے دیا۔

یونہی عرصہ دراز گزر گیا اور پھر ان دونوں کی باہم کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ ہمارے انجینئر ایم۔ این۔ زیڈ صاحب کو سوہاج سے ایسی حالت میں گرفتار کر لیا گیا جب وہ دفتر میں بیٹھے زرعی امور کے بارے میں گوشوارے بنا رہے تھے۔ جیل میں انہیں جب لایا گیا تو ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ابوزعبل میں اُن سے اخوان المسلمون کی خفیہ تنظیم کے بارے میں اُسی طرح پوچھ گچھ کی گئی جس طرح منکر نکیر کسی کافر سے کرتے ہیں۔ اس بیچارے کو بڑا ہی سنگین اور خوفناک عذاب دیا گیا۔ وہ اس بات سے قطعاً بے خبر تھا کہ اُسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ وہ جیل میں برہنہ رینگ رہے تھے۔ اُن کے دونوں ہاتھ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ شدت درد سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔

تعذیب و تشدد کے نتیجے میں آخر کار انجینئر صاحب نے تسلیم کر لیا کہ وہ اخوان کی خفیہ تنظیم کے رکن ہیں۔ پھر انہوں نے پوری کوشش کی کہ اپنے بیانات کو وزنی اور مؤثر بنائیں مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ وہ ایسی کسی تنظیم کو اصلاً جانتے ہی نہ تھے۔ اور نہ اُن کا علمی اُفق ایسے معاملات کا احاطہ کرنے کی گنجائش رکھتا تھا۔ یہ بھلا مانس انسان اعصابی لحاظ سے بالکل تباہ ہو گیا۔ گرفتاری کے تمام عرصہ میں وہ اعصابی حملوں کا شکار رہا۔ اور تین سال کے بعد اُسے جب رہا کیا گیا تو وہ ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی ہر لحاظ سے ناکارہ ہو چکا تھا۔

۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات میں نے جاگ کر گزاری۔ تمام شب میں "اوکھلی" میں سلاخوں پر لٹکا رہا۔ صبح ہوئی تو مجھے جیل کے قریب ایک بنگلہ میں لے جایا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بنگلہ میں "تحقیقات" کا ڈرامہ رچایا جاتا تھا۔ یہ پورا دن شدید گرمی میں گزرا۔ اور میری حالت بھی بہت غیر ہو رہی تھی کیونکہ اُس روز مجھے اس قدر مارا گیا کہ پچھلی تمام تعذیب اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔

میجر ف۔ ع کچھ نئی خود ساختہ اور خیالی معلومات حاصل کرنے کے لیے دن بھر مجھے گیند کی طرح تعذیب کے بیلنے میں بیلتا رہا۔ میں برابر اُسے یقین دلاتا رہا کہ جو کچھ میں پہلے کہہ چکا ہوں اُس کے علاوہ میرے پاس کوئی بات کہنے کے لیے نہیں ہے۔ میں خفیہ تنظیم کا رکن نہیں ہوں، تنظیم کے دوسرے افراد سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ نیز ان افراد کے ساتھ میری راہ و رسم نہایت سطحی تھی اور کبھی انہوں نے مجھے اپنے اندر شامل کرنے کا نہیں سوچا۔ ان افراد سے آپ خود پوچھ سکتے ہیں۔

میجر کہنے لگا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ حزب التحریر الاسلامی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟

راقم: یہ کیا بلا ہے۔ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

میجر: لیکن تمہارے گھر سے جو کتابیں برآمد کی گئی ہیں، ان میں حزب التحریر کا لٹریچر ہے۔

راقم: یہ کتابیں قاہرہ کے مکتبوں میں بک رہی ہیں۔ آپ کسی بھی سپاہی کو بھیجیں وہ ایسی سینکڑوں کتابیں خرید کر لا دے سکتا ہے۔

میجر: ان کتابوں کے ساتھ تمہاری دلچسپی کا راز کیا ہے؟

راقم: معلومات عامہ حاصل کرنے کا ذوق۔ انسان کو جانتے رہنا چاہیے کہ اُس کے اِرد گرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔

میجر : ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹیپ کے بند تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ آپ یقیناً اخوان کی تنظیم کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں۔

راقم : لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کس بنا پر مجھے یہ معلومات حاصل ہوں گی۔

میجر : آپ ہی کہہ رہے ہیں کہ انسان کو ارد گرد کی دنیا سے باخبر رہنا چاہیے۔ آپ کی دلچسپیوں کا دائرہ بھی اسلامی طرز کا ہے۔ اور اخوان کی تنظیم بھی اس دائرے میں آتی ہے۔

راقم : جناب! جس تنظیم کی آپ بات کر رہے ہیں وہ خفیہ ہے یا علانیہ؟

میجر : اے ابن کلب! وہ خفیہ تنظیم ہے۔

راقم : تو پھر میں اس سے کیسے باخبر ہو سکتا ہوں۔

میجر : (نتھنے پھلائے ہوئے) اے ابن الکلب! سب نے یہ کہا ہے کہ تم پانچ رکنی کمیٹی کے اندر شامل ہو۔

راقم : اے وائے روز سیاہ! ایک دم پانچ رکنی کمیٹی میں شامل کر دیا؟ یہ غلط اور غیر معقول بات ہے پانچ رکنی کمیٹی سے پوچھ لیا جائے۔

میجر : پانچ رکنی کمیٹی سے پوچھنے پر اگر یہ واضح ہو گیا کہ یہ بات درست ہے تو؟

راقم : تو پھر تمہارے لیے جائز ہو گا کہ مجھے گولی مار دو۔

میجر : اس صورت میں تمہیں جوتے مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔

بار بار اسی طرز کی گفتگو ہوتی رہی۔ موضوع یہی تھا۔ بلکہ الفاظ بھی قریب قریب یہی تھے۔ عصر کے وقت مجھے دوبارہ ف۔ع کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اور اس نے کسی تمہید کے بغیر مندرجہ ذیل سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

میجر : کیا تم خانقاہ والے شعبان کو جانتے ہو؟

راقم : یہ شعبان کا کیا قصہ ہے؟

میجر : اے ابن الکلب! میں جب پوچھا کروں جواب دیا کرو۔ جانتے ہو کتنے گھونسے لگیں گے اور دیکھ رہے ہو کہ کتنی تعداد میں تازیانے میرے پاس پڑے ہیں۔

راقم : حاضر جناب۔

میجر : آؤ بتاؤ۔ خانگاہ والے شعبان کو جانتے ہو؟

راقم: میں اس لقب کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ میرے ملنے والوں میں شعبان نامی کوئی شخص نہیں ہے۔ اور نہ کبھی آج تک میرے علم میں کوئی ایسا شخص آیا ہے جس کا نام شعبان ہو۔ میں یہ بیان لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔

میجر: خوب سوچ لو۔

راقم: حضور بہت سوچا گیا۔ اور میں پوری خود اعتمادی کے ساتھ یہ بیان دے رہا ہوں۔ میں ہرگز ایسے کسی شخص کو نہیں جانتا جس کا نام شعبان ہو، خانگاہ کا رہنے والا ہو، یا کسی اور شہر کا۔

میجر: تم پر بہت بھاری مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

راقم: کیا موجودہ مصیبت سے بھی زیادہ بھاری مصیبت کوئی ہو سکتی ہے؟

میجر: تم عنقریب جان لوگے کہ موجودہ مصیبت سے بھی زیادہ کوئی مصیبت بھاری ہے یا نہیں۔

راقم: خدائے بزرگ و برتر کی قسم، میں شعبان نامی کسی شخص کو نہیں جانتا۔

میجر: جھوٹ و بے لاف گزاف نہ، اپنے آپ کو تیار کرو۔ تمھیں آج رات فوجی جیل بھیجا جائے گا۔

اگر مجھے کوئی شخص گولی مار دیتا تو وہ مجھے محسوس نہ ہوتی۔ مگر فوجی جیل کا نام سن کر میرا دل دھک سے بیٹھ گیا اور میں یکلخت خوف اور بے تابی میں مبتلا ہوگیا۔ ان دنوں ہم فوجی جیل کے قصے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ جس عذاب سے ہم گزر رہے تھے اس سب کے باوجود ہم سمجھتے تھے کہ فوجی جیل کے عذاب سے سخت تر کوئی عذاب ماسوائے عذاب آخرت کے نہیں ہے۔ میرے ذہن میں لحظہ بھر بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ میں فوجی جیل بھی جا سکتا ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر دل کو تھاما کہ میجر کی یہ بات دھمکی سے زیادہ نہیں ہے۔ وہاں جانا بہت دُور کی بات ہے۔ ہم کہاں اور فوجی جیل کہاں۔ یوں کچھ دیر کے لیے میرا دل قدرے مطمئن ہوا۔

لیفٹیننٹ عصام المشوکی میرے قریب ہوا۔ اس نے میری آنکھوں سے پٹی اتاری اور مجھے کہا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے جیل کے اندر آؤں تاکہ میں اپنا ضروری سامان لے لوں اور جیل کا لباس جیل والوں کے سپرد کر دوں۔ میں نے دل میں کہا: یہ بات دھمکی کو زیادہ مؤثر بنانے کا حربہ ہے۔ لہٰذا مجھے بھی خوف زدگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے غرور کو تسکین ہو جائے۔ ہم جیل کی طرف چل دیے۔ پہلی بار میں ان راہوں پہ کھلی آنکھوں سے چلا۔ مجھے نوکدار پتھروں کے وہ ڈھیر نظر آئے جن سے میں ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اور بے تحاشا کانٹے بھی بکھرے پڑے تھے جن سے اس راستے میں بار بار آمد و رفت کی وجہ سے میرے پاؤں زخمی ہوتے

اور آبلہ پائی تک نوبت پہنچی۔ جیل کی دیواروں پر مسلح پہرہ دار کھڑے تھے اور وہ یوں غیظ آلود نظروں سے تکتے تھے جیسے شیطان ہوں۔

جیل کے گیٹ کے سامنے اسی طرح کی ایک بڑی گاڑی کھڑی تھی جو قیدیوں کو ادھر اُدھر لے جانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ویسی ہی گاڑی جس میں ہم قلعہ سے یہاں لائے گئے تھے۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ میں جس بات کو محض دھمکی سمجھتا ہوں کہیں وہ سنجیدہ نہ نکل آئے۔ لیفٹیننٹ عصام الشنو کہنے لگا ـــــ اور اس کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کسی گہرے کنوئیں سے وہ اٹھ رہی ہو ـــــ : تم ابھی فوجی جیل روانہ کر دیے جاؤ گے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: مجھے کیا خبر ہے کہ تمھیں وہاں کیوں طلب کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ گوش گزار کیے دیتا ہوں کہ اگر وہاں جا کر تم نے کچھ اور باتیں بتائیں جو یہاں نہیں کی ہیں تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ ہمیں کام کرنا نہیں آتا۔ اگر ایسی ہی صورت ہوئی تو سمجھ لو کہ تم دوبارہ جب یہاں آؤ گے تو تمھیں قتل کر دینے کے لیے مجھے کسی اور بہانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

یہ سن کر مجھ پر چاروں طرف سے خوف و دہشت کے بھوت ٹوٹ پڑے ـــــ معاملہ تو سنجیدہ ہی نکلا، الٰہی مدد فرما! میں جیل میں داخل ہوا۔ رنگ اُڑا ہوا اور عقل و فکر غائب۔ سیڑھیوں کے پاس بائیس اور افراد بیٹھے تھے جنھیں میرے ساتھ ہی جیل جانا تھا۔ انھیں ایک نظر دیکھنے سے پتہ چل جاتا تھا کہ خوف کے مارے ان کی حالت کس قدر ابتر ہو رہی ہے۔ اکڑوں بیٹھے ہوئے۔ چہروں کا رنگ پیلا۔ سر نیچے لٹکے ہوئے۔ گرمی کی شدت کے باوجود اکثر لرزہ بر اندام۔

لیفٹیننٹ عصام نے مجھے ایک میجر کے حوالے کر دیا جو فوجی جیل یا ارضی دوزخ کی جانب ہمارے کارواں کا سالار بننے والا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا: "تمھارا وہ لباس کہاں ہے جو گرفتاری کے وقت تم نے پہن رکھا تھا"؟ "اوپر بیرک کے اندر پڑا ہے۔" "کتے کے بچے! بھاگو اور اسے جلدی لے کر آؤ"۔ میں بیرک میں گیا تو دیکھا کہ پوری بیرک قیدیوں سے پُر ہے۔ اور یوں نظر آ رہا ہے کہ بیرک نہیں ہے بس آدمیوں سے لدی ہوئی ہے۔ وہ پرانے نظربند جو میرے ساتھ یہاں آئے تھے سب میرے انتظار میں تھے۔ ان میں سے ایک دوست میری طرف بڑھے اور مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگے: حوصلہ کرو، ہم نے سنا ہے کہ تم اب فوجی جیل جا رہے ہو۔ موت تو شدنی ہے۔ قیامت کی گھڑی یقینی ہے۔ اس روز اللہ تعالیٰ کی ذات قبروں میں سے انسانوں کو اٹھائے گی اور میزانِ عدل نصب ہوگی جہاں ہر انسان کو

کیسے کا صلہ ملے گا ——— میری زبان پر دعائیں جاری ہوگئیں - اور میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر نہ ہوسکا - آخر اپنا وہ لباس پہن لیا جس میں گرفتار ہوا تھا - جیل کا لباس لپیٹ دیا - اور ایک گٹھڑی میں پیالہ ، پلیٹ اور الومنیم کا چھوٹا سا نیا چمچہ ، جنہیں میں نے ہی پہلی مرتبہ استعمال کیا تھا باندھ دیے - بیرک کے تمام لوگوں نے مجھے اپنی دعاؤں اور مناجاتوں کے ساتھ اُسی طرح الوداع کیا ، جس طرح اُس شخص کو رخصت کیا جاتا ہے جسے موت کی طرف لیجایا جارہا ہو -

نچلی منزل پہ آیا - اور یہ حقیر گٹھڑی جیل کے ملازمین کو واپس کی اور اُن سے اپنی امانت واپس لی - یہ امانت کیا تھی ؟ تیس مصری قرش - گرفتاری کے وقت یہی کچھ میری جیب میں تھا - اور یہی تیس قرش تیں ایک جیل سے دوسری جیل میں لیے پھرتا رہا - اُس وقت مجھے محسوس ہوا کہ یہ جیل مجھے پیاری لگ رہی ہے - اس لیے کہ جہاں اب مجھے بھیجا جارہا ہے وہ مانند دوزخ ہے - یہ فارمولا بھی مجھے وہاں ہی سمجھ میں آیا کہ نسبت اشیاء کیا ہوتی ہے - جس بات نے مجھے بہت زیادہ خوفزدہ کردیا وہ یہ تھی کہ میں دیکھ رہا تھا کہ خود جلاّد بھی فوجی جیل جانے والوں کو بڑی درد بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے - اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ فوجی جیل کا گرز ابوزعبل کے گرز سے زیادہ سخت ہے - اور فوجی جیل میں ہم پہ جو بلا ٹوٹنے والی ہے وہ اس قدر ہولناک ہے کہ ان کے پتھر جیسے دلوں کے اندر بھی ہمدردیؔ و غمخواری کا مادہ پھوٹ پڑا ہے ——
اے میرے رب کریم کب ہوگی جان بخشی ، تیرا فیصلہ اپنے مقررہ وقت پر ہی صادر ہوگا —— اے دل ناتواں ، حوصلہ کر - مرشد کہا کرتا تھا ؎

بہ قدم قدم پہ سوادِ کوئے جاناں !
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہے پیاری

(باقی)

(بقیہ اشارات) ٹریفک رولز کی پامالی، محاصل میں خیانت، سود کا لین دین، عریانی و فحاشی، رقص و سرود کی مخلوط ثقافتی مجالس، جنسی غلاظت کی نمائش، شراب خانوں کی گردش جام وغیرہ سب کچھ برقرار رہے — حتیٰ کہ چوری چکاری، اغوا، زنا، قتل، جیب تراشی، رسہ گیری جیسے مشاغل کا بھی مؤثر انسداد نہ ہونے پائے۔ بعد ازیں نظام مصطفےٰ آئے یا اسلامی قوانین کے اجراء کے لیے کوئی کونسل اور کوئی تحقیقی ادارہ بنے۔ ممالک اسلامیہ کی کوئی کانفرنس ہو جائے، سیرت پہ کوئی بین الاسلامی سیمینار منعقد کر دیا جائے، حج کی سہولتیں بڑھا دی جائیں، مساجد اوقاف کے زیر انتظام آ جائیں، کچھ لوگوں کو تازیانے بھی لگ جائیں تو چشم ما روشن، دل ماشاد — آخر ہم بھی تو مسلمان ہیں۔

اب تک کے تجزیے سے یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ معاشرے میں سیکولر اسلام کی بڑی منڈی موجود ہے اس منڈی کی مانگ کو سامنے رکھ کر کسی نے ختم نبوت کے بند دروازے میں رخنہ پیدا کیا تاکہ ہاتھ آگے بڑھا کر حسب ضرورت اندر کے محفوظ شدہ احکام و مقاصد میں ردو بدل کیا جا سکے۔ کسی نے آیات قرآنی کے صحیح مفہوم پر سے سنت کے پہرے کو ہٹا کر موقع پیدا کرنا چاہا کہ نوبہ نو مفہوم قرآن میں ڈالے جا سکیں۔ کسی نے ماڈرن اور ترقی پسند اسلام کا سلوگن وضع کیا تاکہ اسلام کو غالب نظریات اور تہذیبوں کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ اور کسی نے یہ تجربہ کیا کہ نعرۂ تکبیر بلند کر کے ہی اسلام کے گلے پر چھری پھیری جائے۔ آخر میں تو نوبت اسلامی سوشلزم تک پہنچی۔ کیا بعید کہ ہمارے ذہین و فطین سیاست بازوں میں کوئی ایسا بھی چھپا بیٹھا ہو جو اسلامی کفر کی ترکیب بھی ایجاد کرنے کی جسارت رکھتا ہو۔

بیرونی قوتیں ایسے عناصر کی ہمیشہ سرپرستی اور پشت پناہی کرتی ہیں۔ جب کوئی شخص اسلام کے چہرے پہ پتھر کھینچ مارتا ہے تو یہ قوتیں کبھی درپردہ اور کبھی علانیہ پکار اٹھتی ہیں کہ شاباش تم نے جدیدیت اور ترقی کے تقاضوں کے پورے عرفان سے کام لے کر ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ اسی طریقے سے قدامت پسند رجعتی عناصر کو شکست دے کر عظیم پاکستانی قوم کو تم نئے تقاضوں کی تکمیل کے قابل بنا سکو گے (اور ہمارے نظریاتی اور تہذیبی پھندوں میں عوام کی گردنیں پھنسا سکو گے)۔

لیکن اب تک کی تاریخ کا ایک سبق نوشتۂ دیوار ہے۔ جو لوگ اسے نہ پڑھ سکے ہوں، ایک بار وہ

بھی پڑھ لیں۔

ہم لوگ برصغیر میں طویل بادشاہتی دور میں سے گزرے، پھر سنگین اور ہوش ربا غلامی سے بھی دوچار ہوئے، پھر برہمنی مہاجنی سازشوں کا بھی ہم نے سامنا کیا، پاکستان میں کرسیوں کی جنگ، الاٹمنٹوں کی رسہ کشی اور محلاتی سازشوں کا مزا بھی ہم نے چکھا، پھر سکندر مرزا ہماری تقدیر سے کھیلے۔ پھر ہم نے صدر ایوب کا دورِ آمریت دیکھا (جو پچھلے پانچ سالہ تجربات کے مقابلے میں غنیمت معلوم ہوتا ہے)۔ پھر یحییٰ خاں آئے، پھر بھٹو صاحب جمہوریت کے لیبل کے ساتھ خوفناک ترین فسطائیت ہمارے سامنے لے کر آئے، اور انہوں نے قوم کی اخلاقی حالت اور معاشی حالت دونوں ہی کو دیوالیہ پن تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

آپ سوچیے کہ یہاں لوگوں نے کیا کیا سازشیں اور جبر و ستم اور خیانتیں کرکے دس دس، دو دو چار چار سال کی حکومتیں چلائی ہیں، اور تخت سے ہر شخص کو بادل نخواستہ اترنا پڑا ہے۔ اور جو بھی اترا، اس کا نام جیسے صفحۂ تاریخ سے باقاعدہ قلم زد کر دیا گیا ہو۔ ہر کوئی "اترا شحنہ مردک نام" بن کر رہ گیا۔ ان کے خوشامدی وزراء بکھر گئے، ان کی سیاسی پارٹیاں درہم برہم ہو گئیں۔ ان کے خاص الخاص فدائی احباب آس پاس سے غائب ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کچھ کیڑے بھنگے تھے جنہیں حوادث نے جھاڑو کی ایک جنبش سے خس و خاشاک کے ساتھ قصرِ تاریخ سے باہر پھینک دیا۔

ان سارے طوفانی اور بحرانی حالات سے گذرنے والی قومِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عوام ہزار خرابیوں اور کمزوریوں اور لغزشوں میں مبتلا ہوئے ہوں (اور ہر قوت نے ان کو ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے پستی میں دھکیلنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں) لیکن ان کے دلوں میں اپنے اسلاف کی قربانیوں، ان کے کارناموں اور کرداروں کی درخشانیوں، اور ان کے علوم اور تصانیف اور تلقینات کی تابانیوں نے اس ٹمٹاتے بیتاب کی شمع کو برابر روشن رکھا کہ خدا کا دین جلوہ فرما ہو اور قانونِ حق نافذ ہو۔ اسی شمع کو ماضی قریب میں مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال جیسی شخصیتوں نے روشن تر کیا، اور آج اس سرزمین پر بھی اور عالمِ اسلام کے دوسرے گوشوں میں بھی ایسی بے پایاں تحریکیں پھیل رہی ہیں جن سے وابستہ صدہا افراد دن رات اسی شمع کو جلانے میں محو ہیں۔ ہر روز کتنے ہی نئے سینوں میں یہ چشمۂ نور جاری ہو جاتا ہے۔

یہ وہ قوت ہے جو ایک بار قائداعظم کی رہنمائی میں چلنے والی تحریکِ پاکستان میں نمودار ہوئی۔ اسی قوت

کے زیر اثر تاریخی قرار داد مقاصد بنی اور اسلامی دستور کا ڈھانچہ وجود میں آیا۔ پھر جہادِ ۱۹۶۵ء میں سمندر کی تہہ سے اُٹھ کر بہ طوفان سطح پر آگیا۔ پھر یہی وہ قوت تھی جو تحریک ختم نبوت کی شکل میں تاریخ کا ایک حصہ بن گئی، اور آج ایک بار پھر یہی قوت ہے جو ہمارے سامنے نمودار ہے۔

اس قوت کی نفی کرنے والے اور اس کے تقاضوں کو عمل میں نہ لانے والے یکے بعد دیگرے سیاسی طور پر مٹ مٹا گئے۔ اب پھر ایک موقع ہے کہ اُمتِ محمّدیہ کی دیرینہ تمنا سے بے تاب کی ہنڈی کو کیش کر دیا جائے قبل اس کے کہ جمہوری حکومت وجود میں آئے۔ خواص اور عوام، سیاسی لیڈر اور سول سروس، معلم اور سپاہی، مزدور اور کسان، صحافی اور ادیب نیز مائیں اور بہنیں پہلے سے متنبہ رہیں کہ خدا و رسول ؐ کا بہت بڑا قرضہ آپ پر واجب الادا ہے۔ تہیہ کرلیں کہ اسے ادا کرنا ہے۔ ورنہ جو بھی قیادت اُبھرے گی اور جو بھی حکومت آئے گی اس کا مقدر پچھلی تاریخ میں سیاسی اسٹیج پر آنے والے نت نئے کرداروں سے مختلف نہ ہوگا۔

سیکولرازم اور سیکولر اسلام کے باطل اصنام پر کتنے وقت، کتنے خون، کتنی جانوں، کتنے مالوں کی بھینٹ چڑھائی جا چکی ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ان پر مزید چند سال بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو غضبِ الٰہی کا نشانہ بنایا جائے، سیدھی طرح اُٹھو اور سیکولرازم کے پورے صنم کدے کو توڑ دو، اور خدا کی حاکمیت اور محمدؐ کی شریعت کے علم گاڑ دو!

جو شخص (اور جو گروہ) اس کارنامے کو انجام دینے میں پیش پیش ہوگا ——— وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی مانند ہو، یا سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی مانند ہو یا اورنگ زیبؒ عالمگیر کی مانند ہو ——— اس کا نام تاریخ کے افق پر مہتاب کی طرح جگمگائے گا۔

یہ کام ہونا ضرور ہے، کوئی بھی آگے بڑھے اور اس سعادت سے بہرہ پائے۔ اس کے مقابلے میں پارلیمانی لیڈری کی واہ وا، چند سالہ یا چند ماہہ حکمرانی کا شکوہ انتہائی بے وقعت ہے۔

اس سلسلۂ گفتگو کا اختتام میں قومی اتحاد سے اپنی ناچیز گذارشات پر کرتا ہوں، کیونکہ پہلی بار قوم کے عوام نے اس سیاسی قوت سے جو اُمید استوار کی ہے کہ اس کا اقتدار نظام محمدی کے قیام کا وسیلہ بنے گا۔ عوام میں اتنی بھرپور اُمید جس نے آناً فاناً ایک ملک گیر تحریک اُٹھا دی، محض اس بناء پر پیدا ہوئی کہ

ملک کے عوام کی مختلف صفوں کو کنٹرول کرنے والی ساری قیادتیں عین اُس مقصد کے لیے جمع ہوگئی ہیں جو ہمارا تاریخی سرمایۂ آمال اور ہمارے مسائل کا بہترین ذریعۂ حل، اور تشکیلِ پاکستان کے اصل مدعا کے حصول کا وسیلہ ہے۔

قومی اتحاد کے لیڈروں کو خصوصاً اور اُن کے پیروکارکنوں کو عموماً اُس بھاری ذمہ داری کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو اُن پر پوری قوم کی طرف سے عاید ہو چکی ہے۔ ضروری ہے کہ وہ اس تاریخی لمحے کو پہچانیں جو ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ اس وقت کے ممکنات کو سمجھیں کہ وہ پاکستان اور اس کے عوام اور ان کے دین کے لیے کتنا بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر وہ اپنے لیے اور اپنی جماعتوں کے لیے وزارتوں اور اسمبلی کی نشستوں اور عہدوں کے چکر میں پڑ گئے تو پھر یہ متفاخرانہ سیاست اقتدار تو کیا دلوائے گی سرے سے قومی اتحاد کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور قومی اتحاد کے کمزور ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ساری قوم جو آج صوبائیت اور لسانیت اور فرقوں کی تقسیموں سے بلند ہو کر تحریکِ پاکستان کے دور کی مانند وحدت کا ایک کاروان بن گئی ہے، وہ ایک بار پھر بکھر جائے۔ خدا نہ کرے، اگر ایسا قومی حادثہ ہو جائے تو اُس کی ذمہ داری ان تمام لوگوں پر اس دنیا میں ہی نہیں، آخرت میں بھی ہوگی جو اتحاد کو کمزور کرنے کا باعث بنے ہوں۔ ابھی کچھ نہیں گیا۔ آپ حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور پہلا فیصلہ یہی کریں کہ مطلوبِ حقیقی کیا ہے، غلبۂ اسلام یا آپ کی جماعت کا غلبہ اور آپ کی اپنی کیبنٹ[1]! پھر اگر آپ اسلام کو چن لیں تو اسلامی تقاضوں

---

[1] ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ اقتدار طلبی کے ساتھ استعجال پسندی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی ہلے میں اقتدار ملے، بلا شرکتِ غیرے ملے یا اس کا حصۂ کبیر (LION'S SHARE) ہاتھ آئے، خصوصاً وزارتِ عظمیٰ کی مسند ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ حالانکہ ملک کے حالات اتنے پیچیدہ ہیں کہ وسائل کی کمی اور مسائل کی کثرت کا حساب برابر کرنے کی کوشش میں بار بار وزارتی نقشے بدل سکتے ہیں اور باری ایسے شخص یا گروہ کی بھی آسکتی ہے، جو خاموش ایک کونے میں بیٹھا ہو یا جسے بالارادہ اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے سے گریز ہو۔ استعجال اور تفرد لاپن نہ صرف سیاسی شعور اور قائدانہ بصیرت کی کمی پر دلالت کرتا ہے بلکہ وہ اس بات کی شہادت بھی دیتا ہے کہ کوئی ایسا اعلیٰ مقصد سامنے نہیں جس کے لیے کچھ لیے بغیر بھی عمریں صرف کی جا سکتی ہوں۔ ایسی عامیانہ سیاست کے لیے خدا و مصطفیٰ کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت۔ سیدھی طرح روٹی، کپڑا، مکان کا راگ دورِ رفتہ (باقی بر صفحہ ۴۸)

ہی کو معیار بنا کر ثانوی حیثیت کے باقی تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے منصفانہ فارمولے بن سکتے ہیں۔

ایک ضروری بات یہ ہے کہ جب کوئی نیا مسئلہ نمودار ہو جس پہ پبلک میں اظہار رائے کرنا ضروری ہو تو اگر ساری مجلس کو طلب نہ بھی کیا جا سکتا ہو تو کم سے کم تین اصحاب کی ایک ایسی کمیٹی مامور ہونی چاہیے جو مختصر ترین نوٹس پہ جمع ہو سکتی ہو اور وہ امکانی حد تک دیگر قائدین کے سامنے بھی ٹیلیفونی رابطہ قائم کرے اور پالیسی کی لائن طے کر کے سب کو اس سے مطلع کر دے۔ جب تک ایسا نہ ہو تو سوال کرنے والوں سے کہا جا سکتا ہے کہ ہماری پالیسی کمیٹی یا پوری مجلس نے ابھی فیصلہ نہیں دیا، لہٰذا فی الحال کچھ نہیں بتایا جا سکتا۔ اس طرح "جتنے منہ، اتنی باتیں" کا سلسلہ بند ہو جائے گا، نیز روزمرہ مسائل میں بار بار موقف کی تبدیلی کا مظاہرہ نہیں ہونے پائے گا۔

آخری بات یہ کہ اگر بھٹو ازم کا طلسم پوری طرح ٹوٹ جائے اور حالات آپ کو کام کرنے کے مقام تک پہنچا دیں تو سب سے پہلے سیکولرازم کے اڈوں اور مغرب زدہ الحاد کیش، اباحیت پسند، اشتراکیت نواز اور مفاد پرست شخصیتوں، خاص طور پہ ان میں سے خرانٹ مہرہ بازوں کو پہچانیے، کیونکہ ان کو غیر مؤثر بنائے بغیر کوئی بڑی تبدیلی ——— خصوصاً اسلام کے حق میں ——— نہیں لائی جا سکتی۔ یہ باتیں ناقدانہ اور ناصحانہ نہیں، بلکہ خیرخواہانہ انداز کی گذارشات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) سے زیادہ اونچے سُروں میں الاپیے، ہر قصب کے لوگوں کو سامنے لائیے، باہر سے کوئی سرپرستی ملے تو اسے بھی شکریے کے ساتھ قبول کیجیے۔ اور کھُل کر کرسیوں کا معرکہ سر کیجیے۔